ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۱۰-۱۷ جون سنہ ۱۹۷۱ء

قیمت :— ۵۰ پیسے　　ہوائی ڈاک سے :— ۶۰ پیسے

فرید قریشیوں کا
ثقافتی اِنقلاب

صفحہ ۷ پر ملاحظہ فرمائیں



بلدیہ کراچی!

یہ تیرے سادہ دل شہری کدھر جائیں

فیڈرل بی ایریا کراچی کے بلاک ۱۶ میں ایم اے قادری صاحب نے ۱۲۰ گز کا ایک پلاٹ لیا، کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی نے اس کا نقشہ ۱۶ نومبر ۱۹۷۰ء کو منظور کیا۔ اس پر مالک مکان نے سر چھپانے کے لئے ابھی صرف ایک کمرہ ہی تعمیر کروایا تھا، چار دیواری بھی اس پلاٹ پر مکمل نہیں ہوئی تھی کہ کراچی میونسپل کارپوریشن کے جی ڈویژن نے پچھلے تین سال کا ٹیکس ادا کرنے کا نوٹس بھیج دیا۔ یہ نوٹس جو صاحب لے کر آئے اُن کا مُلاقاتی کارڈ بھی نوٹس کے عکس کے ساتھ دیا جارہا ہے۔ اِن کا نام نامی سید منظور الدین احمد ہے اور وہ کے ایم سی میں سب انسپکٹر ہیں۔ کارڈ پر ملاقات کے لئے انھوں نے گھر کا فون، پتہ اور وقت ملاقات دے رکھا ہے۔ دفتر میں ملنا نہیں چاہتے۔

اس نوٹس سے مطلقاً علم نہیں ہوتا کہ یہ نوٹس کس کے نام، کس کے دستخطوں سے اور کس تاریخ کو جاری کیا گیا۔ یہ پہلا نوٹس نہیں ہے، ایسے نوٹس آئے دن لوگوں کو ملتے رہتے ہیں۔ نوٹس لے کر ان حضرات کو گوجر نالے پر واقع دفتر پہنچنا پڑتا ہے یہاں جب اُن کی شنوائی نہیں ہوتی تو چپراسی انھیں "صاحب" تک پہنچنے کے مختلف طریقے بتاتے ہیں۔ ٹیکس بچانے کے لئے صاحب کے گھر کا خرچ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے اور بیگم صاحب کو شاپنگ بھی کروانا ہوتی ہے۔ جب "لین دین" طے ہو جاتا ہے تو ضروری اندراجات کر کے رجسٹر میں خانہ پُری کر دی جاتی ہے۔ اس نوٹس میں تاریخ اور نام کا خانہ اسی لئے خالی رکھا گیا ہے کہ لین دین کی گنجائش رکھی جائے اور یہ نوٹس کسی اور کو بھجوا دیا جائے۔

روپیہ کراچی میونسپل کارپوریشن کے خزانے میں جاتا ہے یا افسروں کی جیب میں۔ یہ بات ہم کیوں سوچیں، کے ایم سی سوچے اور جواب دے۔

آپ کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے

"الفتح" کے ایک مستقل قاری نے اپنے ساتھ بیتنے والی یہ واردات سنائی اور کے ایم سی کے حکمنامے کا عکس بھی دیا "لین دین" کے یہ واقعات عام طور پر ہوتے رہتے ہیں۔ پانچ روپے کے ٹیکس سے لیکر لاکھوں روپے تک کے ٹیکس بچائے جاتے ہیں۔ اس میں ٹیکس وصول کرنے والے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کو ٹیکس بچانے کے طریقے بھی بتاتے ہیں، اور خود بھی "حق محنت" طلب کرتے ہیں۔ آپ کے یا آپ کے دوست کے ساتھ ایسا واقعہ ہوا ہو۔ تو ذرا بتائیے۔

C.A. & C/D-2 /70-71/1,000 D. Book

30817

مغربی پاکستان گزٹ

(غیر معمولی) ۱۶ - اپریل ۱۹۶۱ء

فارم '۱' نوٹس مطالبہ

بنام ____________

معلوم ہو کہ مبلغ ____________ روپے (896-05)

ذمہ مندرجۂ ذیل جدول کے تحت واجب الادا ہیں

اور معلوم ہو کہ مندرجہ بالا رقم کی ادائیگی کے لئے بل نمبر ____

مورخہ __ __ __ آپ تک پہنچا دیا گیا تھا لیکن مذکورہ رقم مندرجہ بالا بل میں درج شدہ مدت کے اندر ادا نہ کی گئی

لہذا آپ مطلع رہیں کہ اگر مندرجہ بالا رقم اس اطلاع نامہ کے اجراء کے پندرہ یوم کے اندر بلدیہ میں ادا نہ کر دی گئی یا اس مدت میں چیئرمین کو اطمینان بخش معقول وجہ نہ بتائی گئی تو واجب الادا رقم بذریعہ آپ کی قابل منتقل جائیداد یا ناقابل منتقل جائیداد کی قیمت یا [illegible] کے ذریعہ رقم مذا سے وصول کیجائیگی

تاریخ ____________

بلدیہ کراچی

ٹیکس افسر

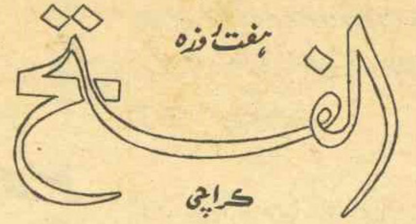
جدول

رقم | (یہاں واجب الادا کی تفصیل دیں)

896-05

S. MANZARUDDIN AHMAD
Sub-Inspector, KMC.
5G, 83/19,
N. Karachi.
Phone: 7-[illegible]

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان



جلد:۔ ۲ شمارہ:۔ ۴

۱۰ ۔۔۔ ۱۷ جون ۱۹۷۱ء

نگران

شوکت صدیقی ۔۔۔ محمود شام

مدیر

ارشاد راؤ

معاونینِ خصوصی

ابراہیم جلیس ۔۔۔ منہاج برنا

افضل صدیقی ۔۔۔ ایم کے جنجوعہ

نائب مدیران

وہاب صدیقی۔ اشرف شاد۔ نعیم آروی

آرٹ ایڈیٹر:۔ غلام نبی بزمی

بدلِ اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے:۔	۶۰ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت ۔۔۔ ۶۰ فلس
دوبئی، قطر ۔۔۔ ۷۵ درہم
سعودی عرب ۔۔۔ ۱۵ قرش
انگلستان ۔۔۔ ۲ شلنگ، ۶ پنس

مقامِ اشاعت

دفتر ہفت روزہ الفتح ۸۷ ڈی نرسری کمرشل ایریا
پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس۔ کراچی ۔۔۔ ۲۹

ایڈیٹر پبلشر ارشاد راؤ ۔ مطبع حقی آفسٹ پریس، لیاقت آباد، کراچی

اداریہ

"کالا روپیہ" برآمد کیجئے

حکومتِ پاکستان نے پانچ سو اور ایک سو روپے کے نوٹ منسوخ کرکے ایک معقول قدم اُٹھایا ہے۔ کیونکہ مشرقی پاکستان میں مختلف بنکوں سے لُوٹے گئے ساٹھ کروڑ روپے کے مسئلے کا ایک یہی حل تھا۔ یہ نوٹ وطن دشمن عناصر کے ہاتھوں میں پہنچ گئے تھے۔ اس سے جہاں سبوتاژ کے واقعات کا خطرہ تھا، وہاں دُوسرے ممالک میں ہماری کرنسی کے پھیل جانے سے ملکی ساکھ خطرے میں پڑ رہی تھی۔ افواہوں کا بازار الگ گرم تھا

یہ نوٹ منسوخ کئے جاتے اور بنکوں میں واپس آنے کے بعد اب حکومت کو سب سے زیادہ اس بات پر زور دینا چاہیے کہ وہ واپس آنے والی رقم کے ذریعے "کالے روپے" کا سراغ لگائے۔ جن لوگوں نے ہزاروں لاکھوں روپے واپس کئے ہیں اُن کے آمدنی کے ذرائع و وسائل کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ اس میں کتنی رقم جائز ذرائع سے آئی اور کتنی ناجائز ذرائع سے۔ نوٹوں کی منسوخی کے بعد چونکہ اِن نوٹوں کی حیثیت صرف کاغذ کے ایک پُرزے کی رہ جاتی ہے اس لئے تمام سرمایہ دار نوٹ ضرور واپس کریں گے۔ احتساب کے ڈر سے ممکن ہے وہ مختلف افراد کے ذریعے سے بنکوں میں نوٹ واپس کروائیں۔ بعض بنکوں کے عملے اور مینجر بھی سرمایہ داروں سے مستقل تعلقات کے سبب ان کو مختلف طریقے خود سکھائیں گے۔ ممکن ہے، ایسے واقعات بھی ہُوئے ہوں کہ بعض رقمیں پچھلی تاریخوں میں اکاؤنٹ میں جمع کردی گئی ہوں۔ اس کی چیکنگ بھی ہوسکتی ہے

ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس اقدام کے ذریعے ملک کی گرتی ہُوئی معیشت کو بڑی حد تک سنبھالا دیا جاسکتا ہے۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں نے لاکھوں روپے کے ٹیکس روک رکھے ہیں۔ حکومت کے دُوسرے واجبات ادا نہیں کئے، ان کی رقموں میں سے یہ ٹیکس وضع کئے جائیں۔ ایسے سرمایہ داروں کو عبرت ناک سزائیں بھی دی جانی چاہئیں۔ اگر کالے روپے کا سراغ ملتا ہے تو اس سے قوم کو آگاہ کیا جائے تاکہ ہمارے اس بہروپ طبقے کا کردار عوام کے سامنے آئے۔

نوٹوں کی منسوخی کے دنوں میں روزمرّہ ضرورت کی بے شمار اشیاء کے دام خود بخود گر جائیں گے، کیونکہ مارکیٹ میں کرنسی کم تعداد میں رہ گئی ہے۔ اس لئے قوتِ خرید بھی کم ہو جائے گی۔ اس سے یہ اندازہ ہوسکے گا کہ کتنی اشیاء کے دام مصنوعی طور پر بڑھا دیئے گئے ہیں۔ مہنگائی کم ہوجانے سے عوام کو جو اطمینان نصیب ہوگا، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ماہرینِ معاشیات اور متعلقہ محکموں کو سائنسی نقطۂ نظر سے اقدامات کرنے ہونگے

اگر اس بہت بڑے اقدام کے وقت بھی احتسابی اداروں نے خلوصِ نیت، قومی جذبے اور استحصال کشی سے کام لیتے ہوئے لاکھوں کروڑوں کالے روپے کو قبضے میں نہ لیا تو عوام سمجھیں گے کہ ہمارے ملک کے احتسابی اداروں پر بھی سرمایہ داروں کا تسلّط ہے اور وہ اُن کے زیرِ اثر ہیں

باقی صفحہ ۲۲ پر

پاکستان کو ملنے والی ۲۶ جیپیں مدراس پہنچ گئیں

جہاز پانچ روز کراچی ٹھہرا مگر اصفہانی لمیٹڈ نے جیپیں نہ اُتاریں

یونیسف (اقوام متحدہ) کی جانب سے پاکستان کو بھیجی جانے والی ۲۶ جیپیں اور دُوسرا سامان مدراس کی بندرگاہ پر اُتارا جا چکا ہے۔ حالانکہ جس امریکی بحری جہاز میں یہ سامان لدا ہُوا تھا۔ وہ پانچ روز تک کراچی کی بندرگاہ پر لنگر انداز رہا۔ مگر پاکستان میں امریکی جہاز راں کمپنی کے ایجنٹ میسرز اصفہانی لمیٹڈ نے اس طرف توجہ نہ دی۔ اب اس سامان پر بھارتی حکومت کا مکمل قبضہ ہے۔ ادارہ اپنے قارئین کی دلچسپی کے لئے اس کی تفصیل پیش کر رہا ہے

نمائندہ خصوصی

یونیسف نے ۲۶ جیپیں اور دُوسرا سامان مشرقی پاکستان کے لئے بھیجا تھا اور اس کی اطلاع میسرز اصفہانی کو بھی دے دی تھی۔ اس پر اصفہانی کی طرف سے نیویارک ۱۵ اپریل ۷۱ء کو کراچی سے ایک ٹیلیگرام ارسال کیا گیا جس میں، ڈی۔ جی۔ پورٹ شپنگ کے سرکلر کی وصولی کا اعتراف درج تھا اور مشرقی پاکستان میں اُن دنوں کی صُورت حال کا تذکرہ کرتے ہُوئے کہا گیا تھا کہ سامان چاٹگام یا چالنا کی بندرگاہ پر نہیں اتارا جاسکتا۔ لہذا کراچی میں سامان اتار دیا جائے اور یہ ممکن نہ ہو تو غیر جانبدار ملک کی بندرگاہ پر جیپیں اور دوسرا سامان اتار دیا جائے۔ بھارت میں کسی بھی صورت اُترنے نہ پائے۔

اس سلسلے میں کراچی، نیویارک، کلکتہ اور چاٹگام کے درمیان تاروں کا تبادلہ ہوتا رہا ایک دُوسرے کو سامان کی آمد کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی گئیں۔ امریکی کمپنی نے اپنے پاکستانی ایجنٹ کو تمام صورتِ حال سے باخبر رکھا اور پاکستانی ایجنٹ دفتری خانہ پُری کے طور پر تاروں کا جواب دیتا رہا۔ لیکن اس نے یہ پروا نہ کی کہ امریکن ایکسپورٹ اسبرانڈسن لائینز کا بحری جہاز کراچی میں لنگر انداز ہے اور اس سے سامان اتروا لیا جائے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حکومتِ پاکستان نے ان دنوں مشرقی پاکستان کی بحرانی صُورت کے پیشِ نظر پرائیویٹ فرموں کو واضح ہدایت کر دی تھی کہ مشرقی پاکستان کو بھیجا جانے والا سامان چاٹگام اور چالنا کی بندرگاہوں پر نہیں اتارا جائے گا بلکہ اس ضمن میں جو اقدامات کئے جائیں اُن میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ سامان کراچی کی بندرگاہ پر وصول کر لیا جائے۔ غیر ملکی جہاز راں کمپنیوں کے لئے اس میں مشکل ہو تو اُن سے کہا جائے کہ پاکستان کا مال بھارت کسی صورت میں نہ پہنچے بلکہ کسی ایسے ملک بندرگاہ کے حوالے کر دیا جائے جو غیر جانبدار ہو۔

مذکورہ جیپوں اور سامان سے متعلق جو کاغذات میسّر ہیں اُن سے اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے کہ جہاز راں کمپنی نے حتی الامکان حکومت پاکستان کی خواہشات کا احترام کیا۔ اُس کا جہاز پاکستان میں پانچ روز تک رُکا۔ لیکن میسرز اصفہانی نے جیپیں اور سامان وصول کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اس کے برعکس جب یہ جہاز پاکستان سے روانہ ہو گیا تو کلکتہ میں اپنی شاخ سے رابطہ قائم کیا جہاں سے معلوم ہُوا کہ پاکستانی مال مدراس کی بندرگاہ کے حوالے کر دیا گیا ہے

حکومت پاکستان نے اس امریکی جہاز راں کمپنی کے پاکستانی ایجنٹ میسرز اصفہانی سے کیا باز پرس کی ہے۔ اس کا پتہ نہیں چل سکا۔

اس ذیل میں جو تار بھیجے گئے، وہ یہ تھے۔

۱۔ کراچی سے نیویارک۔ ۱۵ اپریل ۷۱ء
الیف۔۱۰۰۔ ڈی۔ جی۔ پورٹ شپنگ کا سرکلر نمبر ڈی۔ (پی) ۱/۱۷ مورخہ ۱۳ اپریل ۷۱ء ملا۔ حکومت پاکستان نے مشرقی پاکستان کی صورت حال کے پیشِ نظر پرائیویٹ سیکٹر میں مشرقی پاکستان کو درآمد کئے جانے والے مال کے بارے میں فیصلہ کیا ہے کہ جو سامان چالنا اور چاٹگام کی بندرگاہ کے لئے ہو اُسے کراچی کی بندرگاہ پر اُتارا جائے۔ جہاں یہ ممکن نہ ہو، کسی غیر جانبدار بندرگاہ پر مال اُتار دیا جائے لیکن کسی بھی صورت میں پاکستانی مال ہندوستان کی کسی بھی بندرگاہ کے حوالے نہ کیا جائے اس سلسلے میں ضروری ہدایات دی جائیں۔

۲۔ کلکتہ سے کراچی۔ ۲۲ اپریل ۷۱ء
۱۸ آکسفورڈ۔ وی ۱۳۴ این وی چاٹگانگ بلینڈنگ ۷۱ یونیسف کی ۲۷ جیپیں جہاز میں ہیں۔ ازراہِ کرم وصول کیجئے۔ نیز اطلاع دیجئے کہ کراچی اور مشرقی پاکستان کے درمیان مواصلات کا نظام بحال ہو گیا ہے۔

۳۔ نیویارک سے کراچی۔ ۲۷ اپریل ۷۱ء
الیف ۱۰۸۹۔ آکسفورڈ این وی چاٹگانگ بلینڈنگ ۷۱۔ فوراً مطلع کیجئے، اگر مال جہاز پر ہے

۴۔ کراچی سے نیویارک۔ ۲۹ اپریل ۷۱ء
الیف ۱۲۱/ ۱۰۸۹ آکسفورڈ وی ۱۳۴۔ ۲۶ جیپیں اور ۱۵ سی/ایس وائرلیس اجازت ملی تو روک لئے جائیں گے۔

۵۔ کراچی سے کلکتہ ۲۹ اپریل ۱۹۷۱ء
نیویارک تار دے دیا ہے نمبر ۱۲۱/۱۰۸۹ آکسفورڈ وی ۱۳۴۔ ۲۶ جیپیں اور ۱۵ سی/ ایس وائر لیس۔ اجازت ملی تو روک لئے جائیں گے۔ کیپٹن او۔ کونر نے رنگون سے تار دیا تھا کہ ۵۶ ٹن چاٹگانگ کا مال روک لیا جائے

۶۔ کلکتہ سے کراچی ۳۰ اپریل ۷۱ء
۲۵۱۵۹ آکسفورڈ یونیسف کی جیپیں نوٹ کر لیں۔ ہم کیپٹن او کونر کے تار کی تصدیق کرتے ہیں

۷۔ کلکتہ سے کراچی۔ ۸ مئی ۷۱ء
۳۰۔ آکسفورڈ وی ۱۳۴ کا مال یونیسف مدراس میں اُتار رہا ہے جو کہ کراچی سے پہنچا ہے

۸۔ کراچی سے نیویارک ۷ مئی ۱۹۷۱ء
۲۶ جیپیں اور ۱۵ وائرلیس جہاز پر رہ گئے

۹۔ چاٹگانگ سے کراچی ۴ مئی ۷۱ء
۵۶ ٹن کارگو کے کوائف بتایئے۔ بلینڈنگ این وی چاٹگانگ ۷۱ کا مال یونیسف نے مدراس پر اتروا دیا ہے۔

۱۰۔ ۲۵ مئی ۷۱ء
ڈی۔ جی۔ پورٹ کو رنگون سے جانے والے مال کی تفصیلات درکار ہیں۔ آپ نے جو ہدایات دی تھیں، وہ بھیج دیں۔

مشرقی پاکستان میں کیا ہوا؟

PAKISTAN Join
...mandi R/A
...Side), Dacca.

THE PEOPLE

Regd. No. DA 68, Phone : 255147, 255148, 255149 Volume 1 No. 84 DACCA, MONDAY, NOVEMBER 9, 1970; KARTICK 23, 1377 (B. S.); RAMZAN 8, 1390; East Pak : 25 Paisa, West Pak : 35 Paisa

Mirpur Turns Into A Mini-Israel For Bengalees

عوامی لیگ کے ترجمان "پیپل" کی عکسی تصویر

یحییٰ نے گول میز کانفرنس طلب کرلی۔ بنگالیوں کو صدمہ (پیپل)

یہ متوسط طبقے، بیوروکریسی اور ابھرتے ہوئے سرمایہ دار کی سازش تھی

محمود شام

"پیبر کام پر نہیں آئے گا۔ وہ ضرور رپورٹ کرے گا۔"

"متوسط طبقے کے وہ لوگ اب بھی یہ سرگوشیاں کرتے ہیں، جو کام پر سب سے پہلے آتے ہیں' ان کا کچھ بھی نقصان نہیں ہوا۔ پہلے کالعدم عوامی لیگ کی آنکھوں کا تارہ بنے رہے' اب کام پر لوٹنے والوں میں بھی انہوں نے پہل کی ہے۔ عام آدمی جو اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ جسے قطعی طور پر یہ علم نہیں تھا کہ شیخ صاحب یا اُن کی ہائی کمان کے بالا بالا کیا منصوبے ہیں۔ کن غیر ملکی طاقتوں سے ساز باز ہے۔ اس کے دماغ میں نفرت کا زہر بھر بھر کے اُسے مجموعی طور پہ مغربی پاکستان کا شدید ترین مخالف بنا دیا۔ مغربی پاکستان کو ایک سامراج کے طور پر پیش کیا گیا۔ میں نے پہلے بھی لکھا تھا کہ کالعدم عوامی لیگ کی یہ تحریک یا سازش متوسط طبقے، بیوروکریٹ، اُبھرتے ہوئے سرمایہ دار اور یونیورسٹی کے اساتذہ کی تحریک تھی۔ اور انہوں نے یہ بندوق عام آدمی کے کندھے پر رکھ کر چلانے کی کوشش کی۔ حالات سے خوفزدہ ہو کر عام آدمی تو مارچ کے تیسرے ہفتے میں ہی شہروں سے دیہات کی سمت جانے لگا تھا۔ شہر اور قصبوں میں جو عام افراد باقی رہ گئے وہ آبادی کے مختلف حصّوں کے درمیان ہونے والے فسادات کا شکار ہو گئے۔ کسی کو اس بنا پر ایذائیں دے کر ہلاک کر دیا گیا کہ وہ اُن کی نسل سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ کسی کو اس لئے ہلاک کر دیا گیا کہ وہ اُن کی زبان نہیں بولتا تھا۔ یہ نفرت پھیلانے میں ہمارے ہم پیشہ اخبار نویس حضرات کا بھی بہت بڑا دخل تھا۔ عوامی لیگ کے ترجمان "دی پیپل" نے نومبر ۱۹۷۰ء میں ہی آبادی کے ایک خاص حصّے کے خلاف نفرت کا زہر اگلنا اور آبادی کے دُوسرے حصّے کو ایک خاص حصّے کے خلاف اُبھارنا شروع کیا۔ ۹ر نومبر ۱۹۷۰ء کے اخبار کی شہ سرخی تھی:

"میر پور۔ بنگالیوں کے لئے ایک چھوٹا اسرائیل بن گیا"

میر پور میں اردو بولنے والے بستے ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا گیا کہ جس طرح کئی کروڑ عرب باشندوں کے درمیان اسرائیل ایک ناسور بنا ہوا ہے۔ اس طرح ۷ کروڑ بنگالیوں کے درمیان میر پور کی بستی وہی کردار ادا کر رہی ہے۔"

خیال رہے کہ ایسی خبروں پر پیپل کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا گیا تھا۔ یہ تو وہ باتیں تھیں جو منظر عام پر آ گئیں۔ ایسی بے شمار سرگرمیاں جاری رہیں جو عوامی حقوق کا بہانہ بنا کر عوام کو مغربی پاکستان ہی نہیں بلکہ پاکستان کے خلاف مکمل طور پر اُبھار دیا جائے اور مشرقی پاکستان کے خطّے کو بھارت کی گود میں ڈال دیا جائے۔ عام طور پر تقریبوں میں پاکستان کے آج تک کے ان تمام رہنماؤں کے خلاف زہر اُگلا گیا جو مشرقی پاکستان سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ شعوری طور پہ عوام کو احساس دلایا گیا کہ وہ ایک الگ وحدت ہیں، جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی اور سیاسی۔ ان کے مفادات الگ ہیں، مسائل الگ ہیں۔ پھر سائیکلون نے اِن نفرت پھیلانے والوں کو ایک بہت بڑا موقع فراہم کر دیا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مغربی پاکستان کے رہنماؤں نے ان دنوں انتہائی مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا۔ ایک پاکستان، مضبوط مرکز اور اتحاد کا نعرہ لگانے والوں کو لاکھوں ہم وطنوں کی موت کا کرب محسوس نہ ہوا۔ ان میں سے کسی نے بر موقع جانے کی زحمت نہ کی۔ اس سے علیحدگی پسند عناصر کو مغربی پاکستان، مرکز اور پاکستان کی وحدت کے خلاف کھل کر بولنے کا موقع ملا۔ مولانا بھاشانی نے پہلی بار مغربی پاکستان کو "اسلام علیکم" اس وقت کہا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے نام لے لے کر مغربی پاکستانی رہنماؤں کو کوسا۔ جس سے مشرقی پاکستان کے محب وطن عوام نے بھی اپنے آپ کو بے سہارا اور مغربی پاکستان کو خود غرض قرار دیا۔ مغربی پاکستان کے عوام نے حالانکہ مصیبت زدگان کو اپنی بساط کے مطابق بھرپور امداد بھیجی' لیکن اس مدد کی کوئی تشہیر نہ کی گئی۔ ریڈیو پاکستان، ٹیلی ویژن، سب نے غیر ملکی امداد کو اُچھالا۔ بھارت کی نام نہاد امداد کا خوب پراپیگنڈہ کیا گیا۔

مغربی پاکستان کے امدادی سامان بھیجے جانے پر ایک فلم بنا کر پریس انفرمیشن ڈیپارٹمنٹ کو بھجوائی گئی کہ وہ اسے مختلف سینما گھروں میں دکھائے۔ اس محکمے کے ذمہ دار افراد نے یہ فلم واپس بھجوا دی کہ بنگالیوں میں مغربی پاکستان کے خلاف سخت نفرت ہے۔ وہ ایسی فلم دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔

یوں مشرقی پاکستان کے عوام کو مغربی پاکستان کے عوام کا خلوص اور جذبہ دیکھنے سے محروم رکھنے کی سازش کر کے بیوروکریسی نے دونوں بازوؤں کے عوام کو ایک دُوسرے سے دُور رکھنے کی مجرمانہ حرکت کی۔

یہ تو میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ امدادی سامان کے پردے میں بہت کچھ خفیہ سامان مشرقی پاکستان پہنچایا گیا۔ امدادی کام کے بہانے امریکی اور برطانوی فوجی یہاں پہنچے اور مختلف علاقوں میں گھومے۔ ایک امریکی جرنیل نے ساحلی علاقوں [illegible] یا۔

اس مرتبہ ڈھاکہ میں قیام کے دوران میں باخبر ذریعے نے ایک اور مصدقہ واقعہ سنایا کہ:

"سائیکلون کے زمانے میں مشرقی پاکستان کے ہوم سیکرٹری نے ایک متعلقہ محکمے سے ایک ہیلی کاپٹر مستعار لیا اور مقصد یہ بتایا کہ وہ کچھ علاقوں میں امدادی سامان پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ ہیلی کاپٹر دن بھر رکھنے کے بعد واپس کیا گیا۔ یہ تمام ساحلی علاقوں پر گھومتا رہا۔ بعض مقامات پر اس نے اپنا ایندھن بھی لیا۔ اس ہیلی کاپٹر میں امدادی سامان کی بجائے جس شخصیت نے سفر کیا وہ بھارت کے ڈپٹی ہائی کمشنر تھے۔ وہی موصوف جن کے بنگلے سے

ایک بھاری طاقت کا ٹرانسمیٹر برآمد ہوا ہے ۔“

یہ واقعات بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے خلاف اس سازش اور عوامی حقوق کی جائز تحریک کو عوام دشمن سازش بنانے میں سب سے موثر کردار بیوروکریسی نے ادا کیا۔ بیوروکریسی کے ذریعے ہی بہت سی اہم فائلیں بھارت پہنچائی گئیں ۔ انہی کے حکم کے ذریعے بعد میں غلّہ اور مختلف اجناس بھارت بھیجے گئے۔ یہی سی ایس پی افسر حضرات تھے جو کئی علاقوں میں مارچ اور اُس کے بعد بنگلہ دیش سرکار قائم کر کے اپنے حکم نافذ کرتے رہے۔ سی ایس پی ایسوسی ایشن آف ایسٹ پاکستان نے تو شیخ صاحب کی غیر مشروط حمایت کا اعلان بھی کیا تھا۔

اب آیئے یکم مارچ سے ۲۵ مارچ تک کی لمحہ بہ لمحہ داستان کی طرف

۲ مارچ

”دی پیپل“ کی شہ سرخی ہے:

”بنگالیوں کی نجات کے لئے مجیب کا اعلان“

خاص باتیں۔ اگر سازشی ہوش میں نہ آئے تو آپ تاریخ بنتی ہوئی دیکھیں گے۔

ایک سوال کہ کیا وہ یکطرفہ آزادی کا اعلان کریں گے؟“

مجیب نے جواب دیا ”آپ انتظار کریں“

۳ مارچ۔ مکمل ہڑتال

ڈھاکہ ضلع عوامی لیگ کی خواتین۔

مختلف کالجوں اور یونیورسٹی کی طالبات کے اجلاس

تعزیت

”الفتح“ کے نائب مدیر وہاب صدیقی کے والد محترم عظیم الدّین گذشتہ دنوں صادق آباد میں رحلت فرما گئے۔ ادارہ الفتح اس غم میں ان کا برابر کا شریک ہے اور پسماندگان سے اظہار ہمدردی کرتا ہے

ہیں نعروں میں مطالبہ کیا گیا کہ ”بنگلہ دیش“ کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا جائے کیونکہ جمہوری عمل تو مفلوج کر دیا گیا ہے۔

مسٹر نور العالم صدیقی نے حاضرین سے کہا کہ وہ ایک ہاتھ اوپر بلند کریں اور دوسرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر حلفیہ قسم کھائیں کہ وہ اپنی مادر وطن یعنی بنگلہ دیش“ کے لئے جان تک کی قربانی دے دیں گے۔ پیپل کے یہ شمارے ان دنوں مغربی پاکستان نہیں آتے رہے ہیں۔ اس لئے بھی قارئین کو مختصر طور پر ان خبروں سے آگاہ ہونے سے اس سازش کے رُخ اور رفتار کا علم ہو جائے گا۔ ان خبروں سے بعض انکشافات براہِ راست ہوں گے اور بعض کا احساس الفاظ کے چناؤ اور خبروں کی ترتیب سے ہو جائے گا۔

۴ مارچ

شہ سرخی ہے ”یحییٰ نے گول میز کانفرنس طلب کر لی“

بنگالیوں کو سخت صدمہ

لفظ بنگالیوں پر زور دیا گیا ہے۔

اسی دن کے اخبار میں ایک خبر جو ایک بکس کی صورت میں نمایاں شائع کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

نیا قومی ترانہ

کل پلٹن میدان میں ہونے والے جلسہ عام میں ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس لیگ کے جنرل سیکرٹری شاہجہان سراج نے اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کی طرف سے جاری کردہ پمفلٹوں سے مستقبل کا لائحہ عمل پڑھ کر سناتے ہوئے تجویز پیش کی کہ قومی ترانہ بدل دیا جائے اور اس کی جگہ رابندرناتھ ٹیگور کا لکھا ہوا مشہور نغمہ اپنایا جائے۔ جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

”ہمارا سنہرا بنگال
ہم تم رہیں خوشحال“

شیخ نے بھرائی ہوئی جذباتی آواز میں کہا ”بنگلہ دیش“ کو آزاد دیکھ کر اس کی روح کو ابدی مسرت حاصل ہوگی۔“

اسی روز ایک اور خبر ہے

”عوام کو تصادم کے طریقے سکھانے کی ضرورت“

”اپنے اوپر مسلّط نوآبادیاتی راج کے خلاف بنگلہ دیش کا عزم اب ایک منظم شکل اختیار کر رہا ہے اور عوام اب بتدریج اور بے ساختہ ظالم قوتوں کے بھاری اسلحے کے دفاع کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر فارم گیٹ پر قدیم طرز کی مگر ذرا بہتر حالت میں بندوقیں اور توپیں نظر آتی ہیں جو کسی بھی وقت کارروائی کے لئے تیار ہیں۔ یہ دفاعی ہتھیار ہر اس سامان سے تیار کئے گئے ہیں جو قریبی طور پر دستیاب تھا۔ مثلاً آر سی سی کے پائپ، پرانی کاروں کی ٹنکیاں، ٹوٹی ہوئی لکڑی، پتھر اور کیا نہیں۔

دشمن کی گاڑیاں تباہ کرنے کے لئے ایک باریک سی دھماکہ خیز لائن بھی بجلی کے خاردار تاروں سے تیار کی گئی ہے۔ معصوم راہگیروں اور عوام کو دشمن کے لئے تیار کئے گئے اس جال سے بچانے کے لئے ضروری تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔

یہ ہتھیار تیار کرنے کے لئے جو محنت اور تکلیف اختیار کی گئی ہے، اس سے واضح طور پر اندازہ ہو جاتا ہے کہ بنگالی اب تلخ انجام تک لڑنے کے لئے آمادہ ہیں۔ منزل کے حصول تک لڑائی جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ مدافعت کے ترقی یافتہ طریقے اور ہتھیار حاصل کئے جائیں“

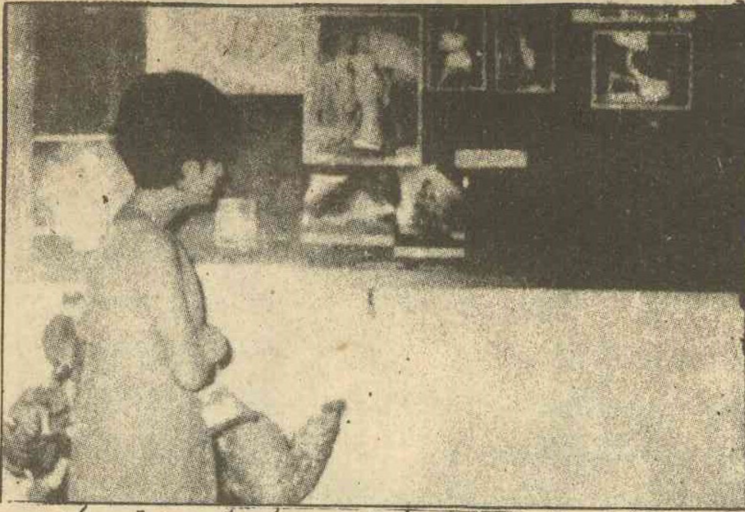
(جاری ہے)

آئندہ ہفتے

- بھاشانی کا اعلانِ جنگ
- ڈھاکہ ایئرپورٹ پر صدر پاکستان کی آمد اور ”پیپل“ کی خصوصی رپورٹ
- صدر کے ڈھاکہ میں قیام کے دوران آرٹسٹوں، افسروں اور صحافیوں کے حیرت انگیز اعلانات
- ریڈیو پاکستان کی بجائے ریڈیو بنگلہ دیش کا قیام



مقابلہ موسیقی میں حصہ لینے والی نوجوان طالبات نائٹ کلب میں، پس منظر میں عریاں تصاویر ہیں۔



مقابلہ موسیقی کی ایک منصفہ بی گورے نائٹ کلب میں داخل ہونیوالے دروازے کیساتھ آویزاں عریاں تصاویر دیکھ رہی ہیں

اس میں کچھ صنعت کاروں، تاجروں اور بیگمات کے نام بھی آتے ہیں

فنکار آرٹ سرکل صرف فرید قریشی کا نام نہیں ہے

اندر کی کہانی ——— اشرف شاد کی زبانی

قریشی اسٹریٹ کے ایک چھوٹے سے مکان پر دستک دیتے ہی دو سہمے ہوئے بچوں نے جھجکتے ہوئے دروازے کا آدھا پٹ کھولا۔ ان کے چہرے پر پھیلے ہوئے سراسیمگی کے اثرات یہ اعلان کر رہے تھے کہ اُن پر کوئی بڑا سانحہ گزر چکا ہے۔ نہایت دھیمی آواز میں اُنھوں نے بتایا کہ "ابا گھر پر نہیں ہیں"۔ ان کی آواز میں خوف کی لرزش نمایاں تھی۔ اُنھیں بہت پیار سے جب ہم نے بتایا کہ "بیٹے ہم تمہارے ابا کے دوست ہیں۔ ہمیں اُن سے کچھ کام ہے" تو اُن کی سوال کرتی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیرتی نظر آئی۔ اور انہوں نے "ابا گھر پر نہیں ہیں" کے جملے کے ساتھ ہی دروازہ بھیڑ دیا۔ مبادا ہم اندر نہ گھس آئیں۔

یہ الحاج فرید قریشی کے بچے تھے جو شہر کے ایک بہت بڑے اسکینڈل میں جکڑے جا چکے ہیں۔ ناظم آباد میں واقع یہ چھوٹا سا مکان جس گلی میں واقع ہے وہ مولانا فرید قریشی کے نام سے ہی موسوم ہے۔ اس گلی کے نکڑ پر نصب بجلی کے کھمبے پر قریشی اسٹریٹ کی تختی لگی ہے۔ مولانا اس محلے میں عید میلادُ النبی کے جلسے کراتے رہے ہیں۔ شاید انہی خدمات کے پیشِ نظر گلی اُن کے نام سے موسوم کر دی گئی ہے۔ ہم جب اُن کا مکان تلاش کرتے ہوئے اس گلی تک پہنچے تو چھوٹے چھوٹے بچے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ اُن ہی سے ایک بچے سے جب ہم نے قریشی صاحب کا گھر دریافت کیا تو اُس نے ایک بار تو چونک کر ہمیں دیکھا اور اُس کے بعد بولا "اچھا وہی نا جو۔۔۔۔" لیکن اس وقت ہمارے گرد جمع ہونے والوں میں سے ایک بچے نے اس کا کندھا دبا دیا۔ اور اُس نے خاموشی سے مولانا کے مکان کی طرف اُنگلی اُٹھا دی۔ بعد میں اُن بچوں کی آنکھوں میں جو جمعہ تک گلی کے بچوں کے ساتھ فٹ بال کھیلتے رہے ہوں گے، نمی تیرتی دیکھ کر ہمیں اُس کا سبب پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

مولانا فرید قریشی لیکن اپنے بچوں کی طرح معصوم نہیں ہیں۔ ان پر ثقافت کے نام پر بے راہ روی پھیلانے کے سنگین الزامات ہیں۔ یہ الزامات اس قومی پریس نے لگائے ہیں جو سیاسی گھٹن کے اس دور میں سنسنی خیز خبروں سے اپنا پیٹ بھر رہا ہے لیکن جس کا پیٹ بھرنے والے اس سے پہلے بڑی عقیدت کے ساتھ مولانا اور اُن کے پروگراموں کی تصویریں شائع کرتے رہے ہیں اور جنھیں خوش رکھنے میں مولانا کو بھی ایک خاص ملکہ حاصل رہا ہے یہ سنگین جرم جس کا اس قدر چرچا ہے کیا مولانا نے تنہا انجام دیا ہے؟ کیا اس میں اُن کا کوئی شریک نہیں ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے لیکن ہمارے قومی اخبارات نے اس سوال کے جواب میں جنم لینے والی کہانی کا گلا گھونٹ دیا ہے اس لئے کہ یہ کہانی جن کی چہرہ نمائی کرے گی وہ ہمارے ان قومی اخبارات کی نظروں میں بڑے معتبر لوگ ہیں۔ فرید قریشی ایک بے ضرر آدمی ہے جو ثقافتی سرگرمیوں اور اس سے متعلقہ امور کے سلسلہ میں سود مند تو ہو سکتا ہے لیکن کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ لہٰذا اس کے خلاف سب کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ البتہ وہ لوگ جن کا فرید قریشی بھی آلۂ کار تھا پیسہ اور اثر و رسوخ رکھنے والے لوگ ہیں۔ اس سماج میں ان کا ایک مرتبہ ہے لہٰذا اُنھیں چھیڑنا مصلحت کے خلاف ہے۔ قومی پریس کی اس مجبوری نے فرید قریشی کو اس پورے ڈرامے کا ہیرو بنا دیا ہے۔ باقی تمام کردار پس منظر میں چلے گئے ہیں۔ صرف الحاج قریشی اسکرین پر لہرا رہے ہیں۔

اخبارات نے فنکار آرٹ سرکل کے بارے میں اب تک جو کچھ شائع کیا ہے اُس کے مطابق جمعہ کے روز پیلس ہوٹل کے نائٹ کلب میں ہونے والے اس مقابلہ میں شرکت کے لئے صرف طالبات کو مدعو کیا گیا تھا۔ یہ طالبات رات گئے تک مقابلہ میں ٹھہری رہیں۔ کلب میں اُن کے ساتھ منتظمین اور دوسرے شرکا نے سخت بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا۔ ان سے راہ و رسم بڑھانے کی کوششیں کیں۔ فلموں میں کام کرنے کی پیش کش کی۔ اور گھر چھوڑنے کے لئے اپنی اپنی کاریں پیش کیں۔ انعامات دے کر واپس لے لئے گئے۔ وغیرہ وغیرہ

انہی اخباری اطلاعات کے مطابق الحاج فرید قریشی کے خلاف بلدیہ اپنے طور پر محکمہ جاتی تحقیقات کر رہی ہے۔ جب کہ ڈپٹی کمشنر اور پولیس نے الگ الگ انکوائری کرنے کے احکامات جاری کئے ہیں۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ مولانا کے خلاف مارشل لاء کے تحت مقدمہ چلے گا۔

اس پورے سلسلے میں مولانا فرید کے علاوہ ابھی تک کوئی اور نام واضح طور پر سامنے نہیں آیا ہے۔ سرکل کے کسی عہدے دار کے بارے میں کسی نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ سرپرستوں کے جو نام لئے گئے تھے انہوں نے لاتعلقی کا اعلان کیا۔ جن کالجوں کی لڑکیوں نے شرکت کی تھی اُن کے سلسلے میں بھی الزامات در الزامات کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن سب اپنی اپنی صفائی پیش کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ محکمۂ تعلیمات نے ان کالجوں کی پرنسپلز کے خلاف تحقیقات کرنے کا حکم دے دیا ہے جنھوں نے لڑکیوں کو شرکت کے لئے بھیجا تھا۔ کالجوں

میری لگدی کسے ناں ویکھی، تے ٹٹدی نوں جگ جان دا

کی پرنسپل نے اُن لیکچررز کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کا اعلان کیا ہے جنھوں نے طالبات کو جانے کی اجازت دی تھی۔ اور شاید یہ لیکچرزان طالبات کے خلاف کارروائی کرنے کی بابت سوچ رہی ہیں جنھوں نے مقابلہ میں شرکت کی تھی۔

اس تمام گورکھ دھندے کو دیکھ کر محسوس یہی ہوتا ہے کہ مولانا فرید قریشی سارے فساد کی جڑ ہیں۔ لیکن کیا واقعی ایسا ہے۔ کیا بلدیہ کے اعلیٰ افسران جواب تحقیقات کے احکامات جاری کر رہے ہیں ایک عرصے سے مولانا کی ان سرگرمیوں سے واقف نہیں ہیں۔ اور کیا وہ لوگ جو عرصہ دراز سے مولانا کی ان سرگرمیوں کے معاونین نہیں رہے ہیں؟ کیا آرٹ سرکل کے وہ عہدیداران بھی برابر کے قصوروار نہیں ہیں جو شروع سے مولانا کے ساتھ اس قسم کے بہت سے پروگراموں میں برابر کے شریک اور حصہ دار رہے ہیں؟ اور کیا نوکرشاہی کے وہ نمائندے اور بڑے سرمایہ دار قصوروار نہیں ہیں۔ جو اس قسم کے بیشتر پروگراموں میں عرصہ دراز سے مولانا کی سرپرستی کر رہے ہیں، سرپرستی قبول کرنے کی منظوری دیتے رہے ہیں۔ ان کی ہر تقریب میں مہمانِ خصوصی بن کر مسندیں سجاتے اور صفِ اوّل کی نشستوں پر لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھے خود کو راجہ اندر ثانی محسوس کرتے رہے ہیں؟ کیا یہ لوگ واقعی آرٹ اور کلچر کے دلدادہ اور پرستار ہیں؟ اس قصے کو جاننے کے لئے اس کا پُورا پس منظر ذرا تفصیل سے جاننا ہوگا!

مولانا قریشی کون ہیں؟

مولانا فرید قریشی بلدیہ کے ایک پرانے ملازم ہیں۔ وہ آجکل آئی بی ایم سیکشن میں ڈیٹا پروسسنگ آفیسر ہیں۔ اس سے پہلے کے ایم سی ورکشاپ میں اسسٹنٹ اسٹور کیپر اور اس سے پہلے ایڈورٹائزمنٹ کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اس حیثیت میں اُن کے خلاف ایک محکمہ جاتی کیس چلا تھا۔ جس پر ان کے اختیارات سلب کر لئے گئے تھے۔ اس کیس کی تحقیقات کئی سال تک چلتی رہی۔ اس عرصے میں انھیں اسسٹنٹ اسٹور کیپر کے عہدے پر تعینات کر دیا گیا۔ ساتھ میں تحقیقات بھی چلتی رہی۔ گذشتہ سال ہی مولانا کو ان تحقیقات کے نتیجے میں الزامات سے بری قرار دیا گیا تھا۔ سحر اکبرآبادی کے نام سے وہ شاعری سے بھی شوق فرماتے تھے۔ خصوصاً نعتیں بہت لہک لہک کر پڑھا کرتے تھے۔ ثقافت سے مولانا کی یہ دلچسپی اتنی ہی پرانی ہے جتنی ان کی بلدیہ کی ملازمت۔

مولانا کا یہ اسکینڈل جو اخبارات میں اسی وقت طشت از بام ہُوا ہے جب کہ اخبارات کو سنسنی خیز خبروں کی ضرورت تھی۔ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن یہ اسکینڈل جس میں مولانا تنہا جکڑے گئے ہیں، ان کے اِن سرپرستوں کی کرمفرمائیوں کا نتیجہ رہا ہے جو اپنے پیسے اور سماجی رتبوں کے ذریعے ثقافت کو پروان چڑھانے کے نام نہاد دعوے کرتے رہے ہیں۔ ثقافت کے نام پر ہونے والی رقص و سرود اور گانے بجانے کی محفلیں جن کی تفریح طبع کا اصل سامان ہیں بلدیہ کے نائب چیئرمین ضیاء اللہ، مقامی صنعتکار نجم الدین ولیکا، مقامی تاجر سرفراز خاں، شوکت حسین ناظمی، سماجی کارکن بیگم سروری عرفان اللہ، سابق مرکزی وزرار محمود ہارون، ایس ایم ظفر، کے پی ٹی کے چیف انجینئر، سیاسی کارکن میجر اشفاق قریشی، یہ سب لوگ مولانا کے مسلسل پروگراموں کے سرپرست رہے ہیں، یا ان میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرتے رہے ہیں۔

گذشتہ سال کے دوران مولانا نے فنکار آرٹ

فرید قریشی کی سجائی ہوئی محفلوں میں راجہ اندر بننے والے روپوش ہوگئے

سرکل کے زیرِ اہتمام ایک فنکشن کیا تھا۔ اس میں ضیاء اللہ مہمانِ خصوصی تھے۔ انہیں وہاں آرٹ سرکل کی طرف سے جذامیوں کے لئے ہسپتال کے لئے گیارہ سو روپے کا چیک بھی پیش کیا گیا تھا۔ گذشتہ سال ہی میٹروپول میں ایک ورائٹی پروگرام ہوا جس میں ضیاء اللہ صاحب کے صاحبزادے مہمانِ خصوصی تھے۔ اس سال کے اوائل میں مولانا فرید قریشی نے کے ایم سی کلچرل سوسائٹی کے نام سے ایک ورائٹی پروگرام کیا تھا۔ اس میں تھائی لینڈ کے قونصل جنرل مسٹر بلنگر مہمانِ خصوصی تھے۔ اور ضیاء اللہ اور بیگم سروری عرفان اللہ اس پورے پروگرام میں خاص طور پر سرگرم تھیں۔ چھ سات ماہ قبل نجم الدین ولیکا آرٹ سرکل کے ایک پروگرام میں مہمانِ خصوصی تھے۔ دو سال قبل گلبار میں ہونے والے ایک پروگرام میں کے پی ٹی کے چیف انجینئر اور اس سے ایک سال قبل آرٹ کونسل میں ہونے والے ایک پروگرام میں شوکت حسین ناظمی مہمانِ خصوصی تھے۔ جس زمانے میں ایس ایم ظفر مرکزی وزیرِ قانون تھے، اس زمانے اُن کے ساتھ بھی مولانا نے ایک موسیقی کی نشست کا اہتمام کیا تھا۔ پیلس کے نائٹ کلب میں ہونے والے اس پروگرام کے مہمانِ خصوصی بھی نوکرشاہی کے ایک بڑے نمائندے، سیکرٹری پلاننگ و ڈویلپمنٹ مسٹر قرنی تھے۔ ان کے علاوہ بیگم سروری عرفان اللہ قرنی صاحب کے دیر سے آنے کی وجہ سے کچھ دیر متبادل مہمان خصوصی رہیں۔ مقامی تاجر سرفراز خاں فرید قریشی کے پروگراموں کے مستقل پروموٹر رہے ہیں، پیلس کے پروگرام میں بھی سب سے اگلی نشست پر تین گوگو لڑکیوں کے برابر میں براجمان ہیں۔ محمود ہارون بھی مولانا کے آرٹ سرکل کے مستقل سرپرستوں میں سے رہے ہیں۔ جس زمانے میں مشرقی پاکستان کے ایک ثقافتی وفد میں کچھ لڑکیاں یہاں آئی تھیں تو بیچ لگنڑری میں مولانا نے سرفراز خاں اور میجر اشفاق قریشی سے مِل کر ان کے ساتھ بھی ایک پروگرام کیا تھا اور انھیں اپنے ساتھ ساتھ لئے گھومتے رہے تھے۔

مولانا فرید کے خلاف بلدیہ کے چیئرمین نے محکمہ جاتی تحقیقات کا حکم دیا ہے لیکن کیا بلدیہ کے ذمہ دار افسران اس سے پہلے مولانا کی ثقافتی سرگرمیوں سے واقف نہیں تھے؟ بلدیہ کے وائس چیئرمین ضیاء اللہ سے مولانا کی قربتوں کا اندازہ تو متعدد پروگراموں میں ان کی شرکت سے ہو جاتا ہے۔ دُوسرے افسران اُن کی ان سرگرمیوں سے کسی حد تک واقف تھے۔ اس کا اندازہ بلدیہ کی ثقافتی انجمن کے قیام سے لگایا جا سکتا ہے جو بلدیہ ہی کے مختلف افسران پر مشتمل ہے اور مولانا فرید ہی جس کے مرکزی کردار بھی ہیں۔

بلدیہ کی ثقافتی انجمن

گذشتہ دنوں قائم ہونے والی ثقافتی انجمن سے قبل بلدیہ میں ثقافت کی ٹھیکیداری کرنے کے دو دعویدار تھے۔ ایک آفرین امام نقوی، جنھوں نے بلدیہ ثقافتی کونسل قائم کر رکھی تھی اور دوسرے مولانا فرید قریشی جن کی انجمن کا نام تھا کے ایم سی کلچرل سوسائٹی۔ لیکن گذشتہ دنوں بلدیہ کے کچھ اعلیٰ افسران نے مصالحت کرا کے ٹھیکیداری کا یہ مسئلہ حل کیا۔ اور اس طرح گذشتہ ماہ ایک ثقافتی انجمن تشکیل پائی۔ ثقافت کو پروان چڑھانے والی اس انجمن کے عہدیداران کے طور پر زیادہ تر افسر چنے گئے۔ بلدیہ کے چیئرمین اور چیف آفیسر اس کے سرپرست منتخب کئے گئے جب کہ سپرنٹنڈنگ انجینئر عبدالمجید ملک صدر، اسسٹنٹ انجینئر محسن بھوپالی انفارمیشن افسر، محمود علی شاہ اور اسسٹنٹ ہیلتھ افسر ڈاکٹر منظور صدیقی نائب صدور، فرید قریشی جنرل سیکرٹری، اسسٹنٹ اکٹرائے سپرنٹنڈنٹ محمد عمر قریشی جوائنٹ سیکرٹری سپرنٹنڈنٹ اشتہارات مسٹر برہان خازن اور اکاؤنٹنٹ ایم اے شمس پبلسٹی سیکرٹری منتخب ہُوئے۔ ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ کے لئے بلدیہ کے افسران پر مشتمل انجمن میں مولانا فرید قریشی کو جنرل سیکرٹری اس لئے منتخب کیا گیا تھا کہ مختلف محکموں کے یہ سب افسران ان کی ثقافتی سرگرمیوں سے اچھی طرح آگاہ تھے۔

مولانا فرید قریشی کے ساتھ سرکل میں مختلف اوقات میں مختلف لوگ رہے ہیں۔ یہ لوگ ان پروگراموں میں مولانا کے پوری طرح شریک کار رہے ہیں خصوصاً پیلس کے پروگرام میں جو کچھ ہُوا۔ لوگوں نے وحید مراد بننے کے جو ریکارڈ قائم کئے ان میں یہی لوگ یا

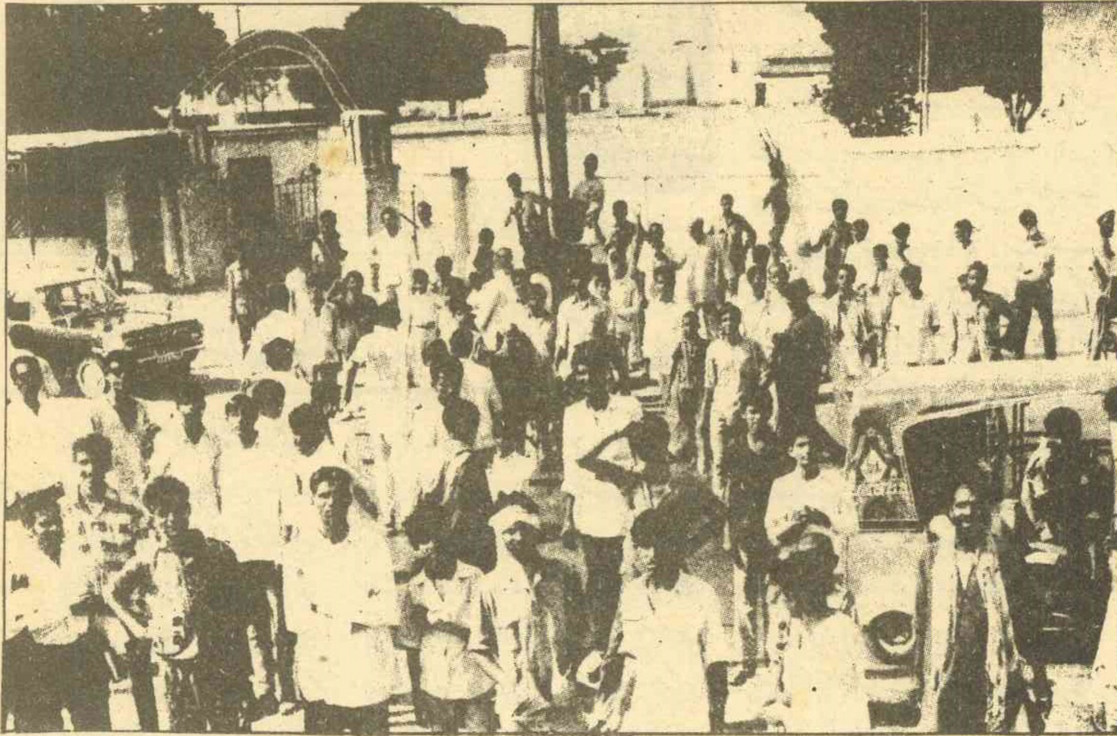
باقی صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ فرمائیں

ایک خبر کی کہانی

کراچی۔۲۹ مئی۔ کراچی سنٹرل جیل کے سامنے سے دو لونڈے دن دہاڑے سینکڑوں افراد کی موجودگی میں بس کے انتظار میں کھڑی ہوئی ایک نوجوان طالبہ کو زبردستی کار میں ڈال کر فرار ہو گئے۔ اس واقعہ کا ایک ملزم اسی جیل کے سپرنٹنڈنٹ کا بیٹا مشکور حسین تھا

آج کل کراچی کی سڑکوں پر مار دھاڑ سے بھرپور سنسنی خیز فلموں کی شوٹنگ ہو رہی ہے

نعیم آروی



اغوا کی واردات کے وقت سنٹرل جیل کے سامنے سینکڑوں لوگ موجود تھے۔

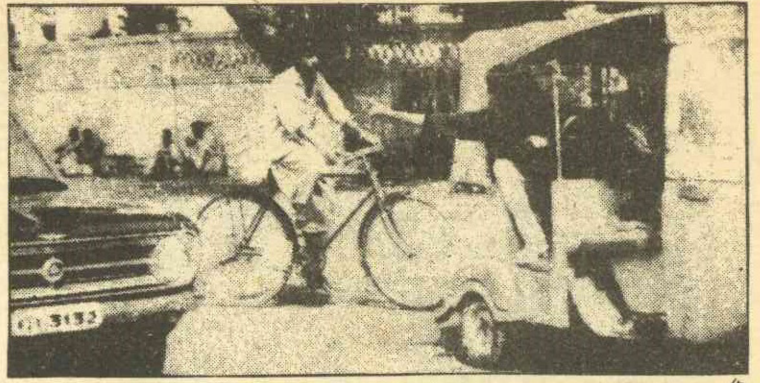
جس روز چھیڑ چھاڑ کا کوئی واقعہ نہیں ہوتا اُس روز اسکول کی چھٹی ہوتی ہے

۲۹ مئی کو، کراچی سنٹرل جیل کے عین سامنے دو آوارہ گرد نوجوان مشکور حسین اور محمد طارق عرف پپن دن دہاڑے ہاتھوں میں خنجر لہراتے ہوئے بس اسٹاپ پر پہنچے اور بس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی دو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کو بالوں سے پکڑا اور اپنی کار میں ڈال کر انگریزی فلموں کے ولین کی طرح ہا۔ ہا۔ ہو۔ ہو کرتے ہوئے فرار ہو گئے۔ کسی میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال دیتا اُن کا فرار اس قدر کامیاب ثابت ہُوا کہ کچھ لوگوں نے تو وہیں کھڑے کھڑے کہہ دیا "اگر یہ کسی فلم کا سین تھا تو میں کھڑکی توڑ ہفتے کی ضمانت دیتا ہوں"۔ واضح رہے کہ مار دھاڑ سے بھرپور اس فلم کے ولین کا کردار جیل سپرنٹنڈنٹ کے صاحبزادے مشکور حسین نے ادا کیا۔ جو شکل و صورت کے اعتبار سے پیدائشی ولین نظر آتا ہے۔ خدا اس اُبھرتے ہوئے نیچرل ولین کو نظرِ بد سے بچائے۔ جی ہاں۔ کیا خبر کل یہ صاحبزادے اپنے اطوار بدل ڈالیں اور سارے معاشرے کی اصلاح کے ٹھیکیدار بن جائیں۔ یعنی ولین کا کردار چھوڑ کر ہیرو بن جائیں۔

ان دنوں کراچی کے مختلف علاقوں میں سنسنی خیز واقعات اور مار دھاڑ سے بھرپور فلموں کی شوٹنگ زور شور سے ہو رہی ہے۔ ہر جگہ ایک ہی قسم کا منظر فلمایا جا رہا ہے۔ بس اسٹاپ پر چند برقع پوش خواتین یا کالجوں کی طالبات کھڑی ہیں۔ بس کا دُور دُور تک پتہ نہیں۔ اتنے میں ایک لمبی سی گاڑی تیزی سے چکر کاٹتی ہوئی اس جگہ پہنچتی ہے۔ ولین کا دوست تیزی سے بریک لگاتا ہے۔ گاڑی چرررر، چوں کر کے ایک دم سے اغوا ہونے والی لڑکی کے سامنے رکتی ہے۔ ولین اپنے چہرے پر تمام خباثتوں کو سمیٹے دیوانہ وار قہقہہ لگاتے ہوئے گاڑی سے باہر نکلتا ہے اور خوبرو حسینہ کی نرم و نازک کلائی تھام کر ہوا میں فائر کر کے چیختا ہے۔ "ہے کوئی جو مجھ سے مقابلہ کر کے اس لڑکی کو بچا لے۔" مجمع پر سکتہ طاری رہتا ہے ڈائریکٹر کی ہدایت کے مطابق پورا ہجوم "بزدلی" اور بے غیرتی کی تصویر بنا دم بخود کھڑا رہتا ہے۔ ولین لڑکی کو زبردستی گھسیٹتا ہُوا گاڑی میں ڈال کر فرار ہو جاتا ہے۔ اس کے آگے کیا ہُوا۔ کیا ولین کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوتی ہے یا ہیرو عین اس وقت اس جگہ پہنچ کر ولین کو للکارتا ہے اور دو دو ہاتھ کرنے کے بعد ہیروئن کو ولین کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے؟ کیا پولیس سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو جانے کے بعد موقع واردات پہ پہنچ کر ولین اور اس کے بدکردار ساتھیوں کو حسب توفیق لعن طعن کرنے کے بعد گرفتار کر لیتی ہے؟ اسی قسم کی ساری معلومات حاصل کرنے کے لئے شوٹنگ دیکھنے والے پردہ سیمیں سے رجوع کرتے ہیں۔

ایسے مناظر کی فلمبندی کے دوران بعض اوقات دلچسپ حادثے بھی رونما ہوتے ہیں شہر کی ایک پُررونق سٹرک پر اغوا کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اغوا ہونے والی خاتون بڑے نیچرل انداز سے چیخ و پکار میں مصروف تھیں اور لوگوں کو اپنی مدد کے لئے بار بار بلا رہی تھیں۔ ہجوم میں ایک شریف آدمی بھی کھڑا ہُوا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا اور وہ مجمعے کو چیرتا ہُوا ولین کے سامنے پہنچ گیا جو ہیروئن کی کلائی پکڑے فرار ہونے کے لئے پر تول رہا تھا۔ اس شخص نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ولین کو ایک زوردار مکّہ جڑ دیا۔ پھر کیا تھا، چاروں طرف شور مچ گیا۔ ڈائریکٹر کٹ کہہ کر چیخ اُٹھا۔ ولین بیچارہ سچ مچ ایک زناٹے دار مکّہ کھا کر زمین پہ گرا ہوا بھیں بھیں کر رہا تھا۔ اس کا پہلے سے سوجا ہوا تھوبڑا مکّے کی ضرب سے مزید سوج گیا تھا۔ ڈائریکٹر نے ان صاحب کو بہت سمجھایا بجھایا کہ یہ فلم کی شوٹنگ تھی۔ تم نے ناحق اپنی ٹانگ اڑا دی۔ مگر وہ اس واقعہ کو مصنوعی واقعہ قرار دینے پر تیار نہ تھا۔ اور لڑکی کو پولیس اسٹیشن یا اُس کے گھر پہنچانے پر مُصر تھا۔ جب ہیروئن نے خود اپنی زبان سے اُس شخص کو یقین دلایا کہ "یہ فلم کی شوٹنگ تھی، حقیقی واقعہ نہ تھا۔" پھر اُسے یقین آیا اور بڑی مشکلوں سے وہ ہیروئن کو ڈائریکٹر کے حوالے کرنے پر راضی ہُوا۔

کہا جاتا ہے کہ وہی شریف آدمی ایک مرتبہ اغوا کی ایک واردات کے عینی گواہ کی حیثیت سے پولیس اسٹیشن بلایا گیا۔ جب اُس سے پوچھا گیا کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک مظلوم اور بے بس لڑکی اغوا کی جا رہی تھی تو وہ خاموش کیوں رہا۔ اس کی مدد کیوں نہ کی۔ تو اُس نے جواب دیا "جناب آپ لوگ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ لڑکی سچ مچ اغوا نہیں کی گئی۔ وہ تو کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی"۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کی اس سادگی پہ پولیس والوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔



ٹیکسی میں سوار غنڈے رکشا میں بیٹھی ہوئی لڑکی کا تعاقب کر رہے ہیں۔ لڑکی انھیں بُرا بھلا کہہ رہی ہے

کراچی کی سڑکیں شکاگو کی سڑکیں بن گئی ہیں

۲۹ مئی کو کراچی سنٹرل جیل کے سامنے اغوار کی کامیاب شوٹنگ دیکھنے والوں نے دوسرے دن اخبارات میں خبر پڑھ کر اپنا سر پیٹ لیا ہوگا کہ اُف توبہ کتنی بڑی خطا سرزد ہوگئی۔ ہم جسے فلم کی شوٹنگ سمجھ رہے تھے وہ تو بڑا حقیقی واقعہ نکلا"

۳۰ مئی کو نیو ٹاؤن مسجد کے قریب اغوار کا دوسرا واقعہ پیش آیا۔ دو نوجوانوں نے ایک نوجوان عورت کو اغوار کرنے کی کوشش کی مگر اس علاقے کے راہگیروں نے اس واقعہ کو فلمی منظر قرار دینے سے صاف انکار کر دیا اور درمیان میں اپنی ٹانگ اڑا کر اس نوجوان عورت کو اغوا ہونے سے بچا لیا۔ ویلن یعنی اغوار کے مجرم کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر وہ موقع پر دھر لئے جاتے تو ممکن تھا کہ وہ آئندہ کسی عورت کو چھیڑنے یا اغوار کرنے سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لیتے۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر لوگ تکلف برطرف حسب توفیق لات، گھونسے اور تھپڑوں سے خاطر مدارات میں ایک دوسرے سے ہمیشہ آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اِدھر چند مہینوں سے کراچی میں اس قسم کے واقعات کی بھرمار ہوگئی ہے۔ ہر روز شہر کے کسی نہ کسی علاقے میں اس قسم کی واردات کی خبر سننے میں آتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کی طالبات سے چھیڑ چھاڑ کے واقعات تو اس قدر عام ہو گئے ہیں کہ جس روز کوئی واقعہ نہیں ہوتا اس روز اسکول کی چھٹی ہوتی ہے۔ بعض شریف والدین نے تو اپنی بچیوں کو اسکولوں سے اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ شہر کی سڑکوں، بارونق علاقوں اور تفریح گاہوں پر مغرب پرست نئی نوجوانوں کا زور بڑھ گیا ہے۔ خواتین کا یا بہ کمال رسوائی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ایک ہفتے کے دوران پے در پے اغوار کی دو تین وارداتوں سے ہر شہری کا دل کانپ اُٹھا ہے۔ اغوار اور قتل کے واقعات وبا کی صورت میں پھوٹ پڑے ہیں۔ آخر اس شہر کو کیا ہو گیا۔ پہلے بھی یہاں انسان رہتے تھے۔ خواتین سودا سلف اور شاپنگ کے لئے باہر نکلتی تھیں۔ طالبات کسی خوف کے بغیر اسکولوں اور کالجوں میں جاتی تھیں۔ اس شہر میں پولیس تھی، تھانہ تھا، چوکی تھی۔ قانون کی عمل داری تھی۔ لیکن ایسے واقعات اس کثرت سے کبھی رونما نہ ہوتے تھے۔ کیا اب یہ شہر پولیس سے خالی ہو گیا۔ قانون کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ جرائم کی بیخ کنی کرنے والے ہاتھ کمزور ہو گئے۔ مجرموں کو احتساب کا خوف باقی نہ رہا۔ آخر کل اور آج میں کیا فرق پڑ گیا۔ کونسی قیامت ٹوٹ پڑی کہ سماج دشمن عناصر ایک دم سے اپنے بلوں سے باہر نکل پڑے، اور شہر میں اغوا اور قتل کی وارداتوں کا طوفان کھڑا ہو گیا۔

کل اور آج میں کوئی فرق پیدا نہ ہُوا۔ البتہ ہماری سوچ نے مشرق سے مغرب کا فاصلہ طے کر لیا۔ کل ہم مشرقی تہذیب کی گود میں تھے۔ آج ہم نے بہت تھوڑے سے عرصے میں مغرب کی مردہ تہذیب کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا ہے۔ ۲۳ سال سے امریکی گندم کھا رہے تھے، اب وہ گندم ہمارے جسم پر کوڑھ کی صورت میں پھوٹ رہا ہے۔ ۲۳ سال سے ہمارے شہر کے بہترین سینما گھروں میں جو انگریزی فلمیں دکھائی جا رہی تھیں۔ اب ان فلموں کے ہیرو ہیروئن اور ویلن ہمارے شہر کی سڑکوں پر مٹر گشتی کر رہے ہیں۔ کل ہمارے گھروں میں ٹی وی نام کی کوئی چیز نہ تھی آج ہمارے گھروں میں ان کے ایریل لگ گئے ہیں۔ ٹی وی کے چھوٹے سے پردے پر آئرن سائڈ، ایونجر اور دی سینٹ کے علاوہ قتل و غارت گری، اغوار اور مار کاٹ کی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ اس شہر کے بک اسٹالوں پر پہلے اپنے یہاں کی کتابیں ہوتی تھیں۔ اب ان کی جگہ امریکہ اور برطانیہ میں چھپنے والا فحش لٹریچر رکھا ہوتا ہے۔ ٹائمز اور نیوز ویک اور ریڈرز ڈائجسٹ کے پیٹرن پر ہمارے یہاں سیاسی، جاسوسی اور ہیبت ناک کہانیوں والے ڈائجسٹ شائع ہوتے ہیں۔ پہلے اس شہر میں اِکّا دُکّا نائٹ کلب تھے، اب ہر گلی کے نکڑ پہ ایک نائٹ کلب بن گیا ہے۔ ان نائٹ کلبوں میں زندہ ناچ گانے کا پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے اس شہر میں دولت کی اتنی ریل پیل نہ تھی۔ اب اس شہر میں دولت کے چشمے اُبلتے ہیں۔

پہلے کالے کاروبار کرنے والے اور چور بازاری کے ذریعہ راتوں رات دولت مند بننے والوں کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی کہ وہ ہماری تہذیب کے اصل خدوخال کو اپنے نوکیلے پنجوں سے کھرچ کر رکھ دیتے۔ مگر دھیرے دھیرے اُن کی تعداد بھی اتنی ہوگئی ہے کہ وہ بالآخر ہماری تہذیب، شائستگی اور معصومیت کے قاتل بن گئے۔ یہ نو دولتئے اپنی عیاشیوں پر دیدہ دلی سے دولت لٹاتے ہیں۔ جرائم

ہماری تہذیب شائستگی اور معصومیت کے قاتل کون ہیں؟

پیشہ افراد کی سرپرستی کر کے معاشرے میں زہر گھولتے ہیں۔ ان کے "دولت کدے" میں پرورش پانے والے ہونہار صاحبزادے شروع دن ہی سے ہاتھ پاؤں دکھانے لگتے ہیں اور آگے چل کر اپنی "کارگزاریوں" سے ملک و قوم کی پیشانی پر بدنامی کا داغ لگانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ذرا اغوا کے مجرموں کی چھان بین تو کیجئے۔ آپ کو ایسے ایسے صاحبزادوں سے سابقہ پڑے گا جن کے باپ دادا اللہ دین کے جادوئی چراغ رگڑ رگڑ کر راتوں رات لاکھوں روپے کی جائداد کے مالک بن گئے۔ آج دستِ غیب سے ملنے والی دولت اُن کے ہر گناہ پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

دیکھئے بات کہاں سے شروع ہُوئی تھی اور کہاں جا پہنچی یعنی بات شہر میں اغوار کی بڑھتی ہوئی شوٹنگ سے شروع ہُوئی تھی اور پہنچ گئی زلف دراز صاحبزادوں تک جو انگلش میڈیم اسکولوں کو بھگتا کر جلدی جلدی کالجوں میں "مائی فیئر لیڈی" کی تلاش میں پہنچتے ہیں اور جب انھیں وہاں سے ناکامی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو پھر وہ کراچی کی سڑکوں پر اپنی ذہنی آوارگی کے نمونے پیش کرنے لگتے ہیں۔

ہمیں اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہیئے کہ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے مغرب زدہ نوجوانوں کے مقابلے میں ہم کچھ غیر مہذب اور غیر شائستہ واقع ہُوئے ہیں یعنی درس گاہوں کو رومانس گراؤنڈ نہیں سمجھتے اور راہ چلتی خواتین اور طالبات کو چھیڑنا، ستانا یا اُنھیں زبردستی اغوا کرنے کی جسارت کو اس ترقی یافتہ "ایج" میں بھی ناقابلِ معافی جرم سمجھے ہُوئے ہیں۔ میرے پڑوس میں ایک پرانے خیالات کے میر صاحب رہتے ہیں، جس روز اخباروں میں اغوار کی خبر شائع ہُوئی، بھاگے بھاگے میرے پاس آئے اور مجھے مخاطب کرتے ہُوئے کہا "صاحبزادے دیکھ لیا۔ پڑھے لکھے لونڈوں کے کرتوت؟"

میں نے میر صاحب سے کہا "میر صاحب اچھے بُرے تو ہر جگہ رہتے ہیں۔

فرمایا "میاں ایسے ایک لونڈے کا نام بتا دو جو ہم جیسے غیر مہذب اور غریب طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ اب میں تمھیں کیا بتاؤں۔ اپنے پڑوس میں ایک نبری رہتا ہے، مگر کیا مجال جو نظر اُٹھا کر چلے۔ محلے سے گزرتا ہے تو اُس کی آنکھیں زمین میں پیوست ہوتی ہیں کئی بار تو راہ گیروں سے ٹکرا گیا۔ کبھی آپ نے اس کا نام ایسے معاملات میں سُنا ہے؟ میاں ہم لوگوں سے اُنگل بھر غلطی ہو جاتی ہے تو لوگ اُسے بانس برابر بنا لیتے ہیں۔ اور بڑوں کے ہاں پہاڑ جیسی بات رائی بنا دی جاتی ہے"۔

میر صاحب اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ کر چلے گئے اور مجھے ایک نئی آگ کی آنچ میں سلگتا ہوا چھوڑ دیا۔ بڑے میاں نے کیا خوب بات کہہ دی۔ ہماری معمولی غلطی پکڑ میں آ جاتی ہے اور محلوں اور عالیشان بنگلوں میں رہنے والوں کی بڑی سے بڑی غلطی بھول چوک سمجھ کر نظرانداز کر دی جاتی ہے"۔



ایک بھارتی ترمیم پسند کا واویلا

بھارت کے ایک اردو ماہنامہ "روبی" کا یہ تراشہ۔ بھارت کے نام نہاد ترقی پسند ادیب کے ذہنی دیوالیہ پن کا ایک ثبوت ہے۔ یہ ترقی پسند ادیب چند ماہ پہلے پاکستان تشریف لائے تھے۔ ہمارے ترقی پسند ادیبوں اور سیاسی کارکنوں نے انھیں بڑی ضیافتیں بھی دی تھیں۔ ان کا یہ تازہ ترین مضمون، دراصل صدر پوڈگورنی کے اس خط کی بازگشت ہے جس کا پاکستان نے معقول جواب بھی دے دیا تھا۔ اپنے اس مضمون کے ذریعے انہوں نے کئی پاکستانی ادیبوں اور رہناؤں کو بلاوجہ اس میں الجھا کر اپنے بھارتی اور روسی آقاؤں کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مشرقی پاکستان جو پاکستان کا ایک حصہ ہے اور جس میں اپنے حقوق کے لئے خود وہاں کے اور پاکستان کے عوام جد وجہد کر رہے ہیں۔ اس کے بارے میں غم کھانے والے خواجہ احمد عباس مغربی بنگال کے عوام پر ہونے والے ظلم وتشدد پر کیوں خاموش رہتے ہیں کشمیر کے پچاس لاکھ مظلوموں کی چیخیں انھیں سنائی نہیں دیتیں۔ ہندوستان میں کہیں مذہب اور کہیں ذات کے نام پر جو خون بہایا جا رہا ہے، خواجہ صاحب اس کی فکر کریں۔ پاکستان کے مختلف حصوں میں ہونے والی عوامی جدوجہد کے رُخ اور کردار سے یہاں کے لکھنے والے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ وہ قلم کی آبرو سے بھی باخبر ہیں۔

(ادارہ)

شاعر کا دل اور بنگلہ دیش

خواجہ احمد عباس

ماہنامہ روبی، جون ۷۰

بھارتی جریدہ ماہنامہ "روبی" سے لئے گئے مضمون کے عنوان کا عکس

سارے جہاں کا درد اُن کے جگر میں ہے

شاعر کا دل۔ اور خصوصاً ترقی پسند شاعر کا دل عوام کے دھڑکتے ہوئے دلوں کا، ان کی امنگوں امیدوں، آرزوؤں اور حسرتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

شاعر کا دل صرف ایک گوشت اور خون کا لوتھڑا نہیں ہوتا۔ بلکہ انسانی احساس کا "بیرومیٹر" ہوتا ہے شاعر کا دل بڑا حساس ہوتا ہے۔ وہ دنیا بھر کے انسانوں کے اور خاص کر اپنے ہم وطن انسانوں کے ہر دُکھ اور درد، ہر رنج وغم کو محسوس کرتا ہے۔ کوئی بھوکا ہوتا ہے تو وہ خود بھوک کی شدت کو محسوس کرتا ہے۔ کوئی بے گھر ہوتا ہے تو وہ خود کو خانہ بدوش سمجھتا ہے۔ کوئی غلام ہوتا ہے تو وہ غلامی کی بندش اور غلامی کی ذلّت کو خود محسوس کرتا ہے۔ اور اگر دنیا بھر میں کہیں بھی ظلم ہوتا ہے تشدد ہوتا ہے، عوام کی آزادی پہ حملہ ہوتا ہے (جیسا آج بنگلہ دیش میں ہو رہا ہے) تو ہر سنسناتی ہوئی گولی اپنے سینے میں اترتی ہوئی محسوس کرتا ہے، ہر کوڑے کی مار خود اُس کی کمر پر پڑتی ہے اور پھانسی کے ہر پھندے سے وہ خود اپنا گلا گھٹتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

مولانا حالی مرحوم نے اپنے مشہور فارسی شعر میں انسانیت کی جو تعریف کی ہے وہ شاعر کے حساس دل پہ پوری اترتی ہے۔

چیست انسانی؟ تپیدن از تپ ہمسایگان
از سموم نجد در باغِ عدن پژمان شدن

(انسانیت کیا ہے؟ ہمسائے کے بخار سے اپنا بدن تپ اُٹھے۔ اور ریگستان کی گرم ہوا سے عدن کے باغوں میں رہنے والے جھلس جائیں)

ایک انسان، ایک زبان

ایک ہی ایک انسان ——— اور ایک شاعر فیض احمد فیض ہے۔

اس پاکستانی شاعر کے لاکھوں چاہنے والے ہندوستان میں بھی موجود ہیں۔

اس عظیم شاعر نے ہمیشہ ظلم اور استبداد کے خلاف اپنی آواز اُٹھائی ہے۔

بغاوت کے الزام میں برسوں پاکستانی جیلوں کی کال کوٹھریوں میں گذارے ہیں۔

فیض نے دنیا بھر کے ملکوں کے عوام کے درد اپنا درد سمجھا ہے۔ اُن کی آواز میں اپنی آواز ملائی ہے۔ چاہے وہ الجیریا کی جنگ آزادی ہو کہ ویتنام کی، کیوبا کا انقلاب یا امریکہ نیگرو قوم کی جدوجہد ہو، وہ ساری دنیا کی امن تحریک کا سرگرم اور پُرجوش لیڈر رہا ہے۔ یہ وہ شاعر ہے جس نے لکھا تھا، جب وہ پاکستان کی جیل میں بند تھا ــ

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

لاکھوں ہندوستانی اور کروڑوں پاکستانی (جن میں بنگلہ دیش کے ساڑھے سات کروڑ انسان بھی شامل ہیں) سوال کر رہے ہیں کہ آج جب کہ عوام کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ فیض احمد فیض کی زبان خاموش کیوں ہے؟ وہ اس جبر، اس ظلم، اس استبداد کے خلاف آواز کیوں نہیں اُٹھاتا؟

کیا اُس کی آواز کو دبا دیا گیا ہے؟

ہندوستان و پاکستان، ہم آواز

دوسری زبانیں تو بول رہی ہیں، احتجاج کر رہی ہیں، ظالموں کو للکار رہی ہیں۔ بنگلہ دیش کے مظلوموں کے ساتھ ہمدردی اور رفاقت کا اعلان کر رہی ہیں۔

ہندوستان میں کرشن چندر، سجاد ظہیر، کیفی اعظمی اور راجندر سنگھ بیدی، مجروح سلطان پوری کی آوازیں۔

خود پاکستان اور مغربی پاکستانی کے مرزا محمد ابراہیم، عبداللہ ملک، حبیب جالب، حمید اختر، احمد سلیم اور بیگم طاہرہ مظہر علی خاں کی آوازیں ... جنھوں نے ایک مشترکہ بیان میں بنگلہ دیش کے عوام کی جدوجہد کی پوری پوری حمایت کی ہے اور مغربی پاکستان کے جمہوریت پسند عوام کو للکارا ہے کہ بنگلہ دیش کے عوام کی مدد کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ فوجی حکومت کے خلاف، مارشل لا کے سنگین ماحول میں ایسا بیان دینا کمال جرأت کا کام ہے۔

لندن سے پاکستانی طالب علموں کے لیڈر طارق علی نے نوجوان پاکستانی سوشلسٹوں کی طرف سے بنگلہ دیش کے عوام کی حمایت میں ایک پرزور بیان دیا ہے۔

پاکستان کے ان ادیبوں اور دانشوروں کی آوازوں میں بڑی طاقت اور شدت آجاتی اگر ان میں فیض احمد فیض کی آواز بھی شامل ہو جاتی۔

جاگو! ہوا سویرا

آخر بنگلہ دیش کے عوام کا حق ہے فیض احمد فیض جیسے عظیم اور حساس ترقی پسند شاعر پر۔

آج سے کئی برس پہلے فیض نے ایک پاکستانی فلم کی کہانی اور ڈائیلاگ لکھے تھے جو مشرقی بنگال ہی میں فلمایا گیا تھا اور جس میں وہاں کے عوام کی زندگی اور جدوجہد کی جھلک دکھائی گئی تھی۔ اس سلسلے میں فیض نے کافی عرصہ بنگال میں گزارا تھا۔ اور وہاں کی عوامی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا اور اس کو اپنی فلم میں د[illegible] کوشش کی تھی۔

فیض کی لکھی ہوئی کہانی کے عنوان "جاگو ہوا سویرا" کی پیش گوئی بنگلہ دیش کے انقلاب سے پوری ہوگئی ہے۔ صدیوں سے سوتے ہوئے عوام اب جاگ گئے ہیں۔ بنگلہ دیش میں انقلاب کا سویرا ہوگیا ہے، اگرچہ اندھیرے کی طاقتیں اب بھی اس کو دبانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

سویرا ہوگیا ہے، انقلاب آگیا ہے، مگر سویرے کا نقیب کہاں ہے؟ کیوں خاموش ہے؟ کیا اس کو اور اس کی آواز کو ایک بار پھر بند کر دیا گیا ہے۔

فیض کی خاموشی پراسرار اور پریشان کُن ہے۔ کیونکہ اس نے خود اپنے آپ سے ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر ترقی پسند انقلاب پسند دانشور ادیب آرٹسٹ اور عالم کو ان الفاظ کے ساتھ للکارا تھا۔ ان کے ضمیر کو جھنجوڑا تھا ــ

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے ...

بول! — بنگلہ دیش کے ساڑھے سات کروڑ عوام کب سے تیری آواز کے منتظر ہیں۔

اُردن اور اسرائیل کے درمیان خفیہ

شاہ حسین کے نمائندوں کی اسرائیلی حکمرانوں سے خفیہ ملاقاتیں



خبر کی تردید کیلئے پانچ ہزار دینار کی رشوت

محمّد میاں

"عرب چھاپہ مار ایک جداگانہ فلسطینی مملکت کے قیام کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ وہ ہر قیمت پر اقتدار حاصل کرنا اور اُسے دُشمن کو بیچ دینا چاہتے ہیں۔ میں اِن پر آخری ضرب لگانے والا ہوں۔ مٹھی بھر پیشہ ور مجرموں اور سازشیوں کے خلاف فیصلہ کُن کارروائی کی جائے۔ میں اِس سلسلے میں کوئی لیپ و پلیش، تحمل اور سمجھوتہ نہیں چاہتا"

عرب فدائین پر یہ الزامات، انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا ارادہ، آزادیٔ وطن کی راہ کو اپنے لہو سے منوّر کرنے اور رنگین بنانے والوں کو مجرموں اور سازشیوں کی صف میں کھڑا کرنے کا اعلان گولڈا میئر کا ہے؟ جی نہیں، تو پھر موشے دایان کا ہوگا؟ نہیں اُس کا بھی نہیں ہے۔ یہ بیان موشے دایان کا بھی نہیں تو پھر چھاپہ ماروں کو "غدار اور مجرم" کہنے کی جرأت شاہ حسین کے علاوہ اور کون کر سکتا ہے؟ لیکن جناب یہ بیان امریکی سامراج کے سربراہ نکسن کا بھی نہیں ہے۔ یہ بیان اردن کے شاہ حسین کا ہے۔ وہی شاہ حسین جو آزادیٔ فلسطین کے نغمے الاپتے ہیں، جو اسرائیل دُشمنی کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ اعلان بی بی سی، وائس آف امریکہ یا ریڈیو ماسکو نے نشر نہیں کیا۔ بلکہ ریڈیو عمان سے ۲ جون ۱۹۷۱ء کو نشر کیا گیا۔ یہ بیان صرف دھمکی نہیں بلکہ اردنی حکومت کو عرب فدائین اور فلسطینی عوام کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کا حکم ہے کیونکہ اردنی وزیر اعظم وصفی التل نے اپنے شاہ کو یقین دلایا ہے کہ

"ہم گوریلا تحریک کی برق رفتاری سے تطہیر کر دیں گے۔ ہم ان ہاتھوں کو قلم کر دیں گے جو اُردن کی سالمیت اور اتحاد کو ختم کرنے کے لئے بڑھ رہے ہیں"

عرب فدائین کے خلاف فوجی کارروائی کا اعلان اس بات کی علامت ہے کہ اردن میں ستمبر ۱۹۷۰ء کا خونیں ڈرامہ دوبارہ رچانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ عمان کی سڑکوں، گلیوں، کوچوں اور بازاروں کو ایک مرتبہ پھر فدائین اور فلسطینی عوام کے خون سے رنگین کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ اردنی ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں فلسطینی عوام کے گھروں کو مسمار کرنے کے لئے تیار کھڑی ہیں اور امریکی سامراج اور برطانیہ سے امداد میں ملی ہوئی گولیاں ان لوگوں کے سینوں میں پیوست ہونے کے لئے بے قرار ہیں۔ جن کی زندگی بھی انقلاب ہے اور موت بھی انقلاب۔ جو انقلاب کے لئے جیتے ہیں اور انقلاب کے لئے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہیں، جو مسکرا کر موت کا استقبال کرتے ہیں، ماتمی ترانوں کی بجائے توپوں کی گھن گرج میں اُن کے جنازے اٹھتے ہیں۔

شاہ حسین نے عرب فدائین کے خلاف فوجی کارروائی کا حکم کیوں دیا ہے؟ فلسطینی عوام کے لئے آزادیٔ وطن کی ایک ہی راہ رہ گئی ہے کہ وہ محاذِ آزادیٔ فلسطین کے پرچم تلے مسلح جدوجہد کریں۔ لیکن مسلح جدوجہد ایک سوشلسٹ نظریہ ہے اور اس کی کامیابی کے ساتھ ساتھ معاشرتی نظام بھی تبدیل ہونے لگتا ہے۔ یہی بات شاہ حسین کو سخت ناگوار گزرتی ہے اور سوہانِ روح بنی ہوئی ہے کیونکہ انھیں اپنا تاج آزادیٔ فلسطین سے زیادہ عزیز ہے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے اقتدار کو سہارا دینے کے لئے پس پردہ اسرائیل سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ گذشتہ ستمبر میں اس کا واضح ثبوت مِل گیا۔ جب کہ اسرائیلی وزیرِ دفاع موشے دایان نے شاہ حسین کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"تل ابیب، ۲۵ ستمبر۔ اسرائیل کے وزیرِ دفاع جنرل موشے دایان نے فلسطینی چھاپہ ماروں کے خلاف شاہ حسین کی مکمل حمایت کا اعلان کیا ہے۔ ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں انھوں نے غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا "میں اس جنگ میں شاہ حسین کے ساتھ ہوں۔ مجھے امید ہے کہ شاہ حسین چھاپہ ماروں کو اردن کے شہری علاقوں سے مار بھگائیں گے۔ مجھے اُن کی کامیابی کا مکمل اور سو فی صدی یقین ہے"

(روزنامہ مارننگ نیوز مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۹۷۰ء)

اسلامی ثقافت و تہذیب کا تفصیلی پروگرام

۴ جون کے 'جسارت' میں خبر چھپی ہے کہ اردن کی حکومت نے امیرِ جماعتِ اسلامی پاکستان سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اردن کا دورہ کرنے اور اسلامی ثقافت و تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر نوجوانوں سے خطاب کرنے کی دعوت دی ہے۔ جماعت اسلامی کے اعلان میں کہا گیا ہے کہ اس دعوت نامے کے مطابق اردنی حکومت نے نوجوانوں میں اسلامی جذبہ پیدا کرنے اور انھیں حقیقی اسلامی ثقافت و تہذیب سے روشناس کرانے کا تفصیلی پروگرام بنایا ہے۔ مولانا مودودی نے اس دعوت کے جواب میں اردن کو مطلع کیا ہے کہ وہ علالت کی بنا پر مستقبل قریب میں اردن کا دورہ نہیں کر سکیں گے۔

اردن کے اس تفصیلی پروگرام کا ایک حصہ ۳ جون کے اخبارات میں چھپ چکا ہے

"اردن کے شاہ حسین نے اپنی فوج کو فدائین پر آخری ضرب لگانے کا حکم دے دیا۔ مٹھی بھر پیشہ ور مجرموں کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

اس تفصیلی پروگرام کے سلسلے میں اردن کی حکومت نے جن صاحب کو مدعو کیا ہے، ان کے علاوہ اس کارروائی کے لئے اور کون موزوں ہو سکتا ہے؟

...ہ سمجھوتے کا دستاویزی ثبوت مِل گیا



JORDAN
MINISTRY OF FOREIGN AFFAIRS
AMMAN

Date

وزارة الخارجية

١٩٦٧/١٠/..

سري وستعجل

سعادة السفير الاردني في روما المحترم

اشارة الى مذكرتكم رقم م ت/ ١٢٣٨ تاريخ ٧/ ١٠/ ١٩٦٧ المتعلقة بما نشرته جريدة الديلي امريكا الصادرة في روما ان ما ارجوه من سعادتكم بشكل سري للغاية اجراء الاتصالات مع وزير الاعلام والثقافة الايطالي للايعاز الى الصحافة الايطالية بمنع نشر أنباء عن اجتماعات ملك الاردن السرية وممثلوه مع السلطات الاسرائيلية وكذلك الاجتماع مع أصحاب الصحف الايطالية الكبرى وخاصة مع جريدة الديلي اميركا نفي [illegible] بأي شكل من الاشكال ولو كلف ذلك مبلغ خمسة الاف دينار مع التحفظ [illegible]

[illegible] سري للغاية للاتفاق على اصدار بيان ينفي ما نشرته جريدة الديلي امريكا حول اجتماع ممثلي الملك برئيس وزراء اسرائيل السيد ليفي اشكول وابلاغهم أن اي حكومة جديدة في الاردن لا تتأثر سياستها الخارجية مطلقا بتغيير الوزارة وان الاتفاقيات السرية التي عقدت بشكل سري مع حكومة اسرائيل لا تزال سارية المفعول ويلتزم بها الحكومة الحاضرة وغيرها من الحكومات المستقبلية .

وختاما تفضلوا سعادتكم

رئيس الوزراء
وزير الخارجية
بهجت التلهوني

نسخة للديوان الملكي الهاشمي
نسخة للمكتب السري

روم میں متعین اُردنی سفیر کے نام
اُردن کے وزیر اعظم و وزیر خارجہ
بہجت تلہونی کے خفیہ خط کا عکس

اس کے اگلے ہی دن محاذِ آزادیٔ فلسطین نے شاہ حسین پر الزام لگایا کہ انھوں نے اسرائیلی حکومت سے خفیہ معاہدے کر رکھے ہیں۔ اور دونوں حکومتوں کے نمائندوں کی خفیہ ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ اور اسی خفیہ معاہدہ کے مطابق اسرائیلی وزیر دفاع نے اردنی حکومت کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ اس الزام کی شاہ حسین اور اُن کی حکومت نے سختی سے تردید کی۔ ہم ناقابلِ تردید ثبوت کا عکس شائع کر رہے ہیں، جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ شاہ حسین اور اسرائیل کے درمیان خفیہ معاہدات ہیں۔ دونوں حکومتوں کے نمائندے آپس میں ملتے رہتے ہیں۔ روم کے "ڈیلی امریکن" نے ۱۹۶۷ء میں شاہ حسین کے نمائندے اور اسرائیل کے وزیر اعظم لیوی اشکول کے درمیان ملاقات کی خبر شائع کی تھی۔ خبر کے شائع ہوتے ہی اردنی حکومت نے ایک جانب اس کی سختی سے تردید کی۔ دوسری طرف اردنی وزیر اعظم نے روم میں اردنی سفیر کو خبر کی تردید کرانے کے لئے پانچ ہزار اردنی ڈالر (ساٹھ ہزار پاکستانی روپے) تک خرچ کرنے کی ہدایت کی اور روم میں اسرائیلی سفیر سے ملنے کا حکم دیا۔ اردنی وزیر اعظم کا خط ملاحظہ کیجئے۔

س/۳۳/۱۰۴/۶
۱۹۶۷/۱۰/۱۰

خفیہ/اہم

محترم سفیر اُردن (روم)

بحوالہ آپ کے خط رقم م ک/۱۲۳۸ تاریخ ۱۹۶۷/۱۰/۷ متعلقہ نشریہ جریدۃ ڈیلی امریکن صادرہ روم آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ اٹلی کے وزیر اطلاعات اور ثقافت سے انتہائی خفیہ طور پر ملاقات کریں۔ تاکہ اٹلی کے پریس پر اثر ڈالا جائے کہ شاہِ اردن ان کے نمائندوں اور اسرائیلی سرکاری حلقوں کے درمیان جو ملاقاتیں ہوتی ہیں اُن کی مزید خبریں شائع نہ کی جائیں اٹلی کے چوٹی کے صحافیوں سے آپ بھی ملاقات کریں۔ خصوصاً جریدہ ڈیلی امریکن سے گفت و شنید کریں کہ اس خبر کی کسی نہ کسی طریقے سے ضرور تردید کرے۔ اس سلسلہ میں آپ پانچ ہزار اردنی دینار تک خرچ کر سکتے ہیں تاکہ وہ خبر کی تردید کر سکے۔

اس کے علاوہ درخواست ہے کہ روم میں اسرائیل کے سفیر سے بھی بات چیت اور ملاقات خفیہ ہونی چاہیئے آپ اسرائیلی سفیر کو اس بات پر قائل کیجئے کہ وہ بھی ایک ایسا ہی بیان جاری کریں۔ جس میں ڈیلی امریکن میں شاہ کے نمائندوں اور اسرائیلی وزیر اعظم سید لیوی اشکول کے درمیان ملاقات کی شائع شدہ خبر کی تردید ہو۔ ان کو آپ بھی بتا دیں کہ اردن میں نئی تشکیل کردہ حکومت کی وجہ سے ہماری خارجہ پالیسی میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ ہمارے اور اسرائیلی حکومت کے درمیان جو بھی خفیہ معاہدے ہوئے ہیں وہ برقرار رہیں گے اور موجودہ حکومت اور اس کے بعد میں آنے والی حکومتیں بھی لازمی طور پر ان کا احترام کریں گی۔

آخر میں ہماری بہترین تمنائیں

وزیر اعظم
اور وزیر خارجہ
بہجت تلہونی

اس ناقابلِ تردید ثبوت سے بلی تھیلی سے باہر آجاتی ہے۔ شاہ حسین اور اسرائیلی توسیع پسندوں کا گٹھ جوڑ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ موشے دایان فدائین کے خلاف شاہ حسین کی حمایت کیوں کرتا ہے؟

حکومتِ اُردن نے اپنے سفیر کو
اسرائیلی سفیر سے خُفیہ طور پر ملنے کی ہدایت کی

گذشتہ ستمبر میں جب شاہ حسین کے اقتدار کا سنگھاسن ہل رہا تھا تو دریائے اردن کے مغربی کنارے پر اسرائیلی فوج کے مورچے سنبھال لینے اور نوّے ہزار ریزرو فوج طلب کر لینے کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ اب اسرائیل کی بقا کو پھر خطرہ درپیش ہے۔ وہ خوف زدہ ہے، لیکن دنیائے عرب سے نہیں، صرف عرب فدائین سے، کیونکہ مقبوضہ فلسطینی علاقے میں اِن کا اثر و رسوخ اور مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔ چنانچہ اسرائیل کو بچانے کے لئے شاہ حسین ایک مرتبہ پھر فدائین کے خون سے ہاتھ رنگنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ لیکن اُنھیں یاسر عرفات کی یہ للکار بھی سن لینی چاہیئے۔

"ہم تاریخ کا منوّر ترین باب لکھ رہے ہیں۔ یہ تاریخ ہم خون سے رقم کریں گے۔ اور گولیوں سے اسے درخشاں بنائیں گے ہمارے کارناموں کی روشنی دوسروں کے لئے نشانِ منزل کا کام

باقی صفحہ ۱۶ پر ملاحظہ فرمائیں

طمانچے

ر۔ خ۔ روہیلہ

مزدور رہنما

"رحمٰن آخر تم مزدور رہنما بن کر غریب مزدوروں کو کب تک فریب دیتے رہو گے۔ یہ جھوٹ کا لبادہ آخر کب اتارو گے"؟

"جب تک ہمارا مزدور طبقہ نظریاتی طور پر خود کو سوشلزم کے لئے تیار نہیں کر لیتا"۔ رحمان نے جواب دیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی

قانون

مل مزدور: "صاحب میری بیوی سخت بیمار ہے۔ اگر اُسے دوائی نہ دی گئی تو چند روز میں مر جائے گی"

مل مینجر: "تو میں کیا کروں"؟

مزدور: صاحب میڈیکل الاؤنس منظور کرا دیں۔ میری بیوی بچ جائے گی۔ میرے بچے تباہ ہونے سے بچ جائیں گے۔

مینیجر: تم جاہل ہو۔ سمجھتے کیوں نہیں ہو؟ میڈیکل الاؤنس صرف افسروں کو ملتا ہے۔

مزدور: صاحب میری بیوی مر جائے گی۔

مینیجر: قانون کو کون بدل سکتا ہے؟

مزدور: اگر کارخانے کے مالک کا بنایا ہوا قانون میری مریض بیوی کے علاج کا بندوبست نہیں کر سکتا تو اس قانون سے میرا کیا تعلق ہو گا؟

مینیجر: تمہاری باتوں سے صنعتی امن کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

چند روز بعد کوئی معقول وجہ بتائے بغیر مزدور کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔

زندگی

"پاگل مت بنو۔ اب یہ بنگلہ تو رہنے دو۔ آخر تم کہاں جاؤ گے"، شاہینہ مایوس لہجے میں کہتی ہے۔

"وہاں دُور گھاس پھوس کی بستی دیکھتی ہو۔ جہاں آدمی کیڑوں کی طرح رینگتے نظر آ رہے ہیں۔ کل وہاں ڈسپنسری کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔ اور میں اس ملاقے کو چھوڑ کر کل اُسی بستی میں منتقل ہو جاؤں گا"

"تم کتنے ایڈیٹ ہو۔ ایم بی بی ایس کیا۔ "پرائیویٹ پریکٹس نہ کی۔ مزدوروں کا مفت علاج کرتے ہو۔ ڈیڈی اتنی جائیداد چھوڑ کر مرے۔ سب ان "مفلسوں" پر گنوا دی۔ کم از کم مجھ سے ہی سبق لیتے۔ میں اور میرے ہسبینڈ ملازمت بھی کرتے ہیں اور پرائیویٹ پریکٹس بھی۔ کتنی اچھی زندگی گذر رہی ہے۔ کاش تم بھی ایسے ہی ہوتے"۔

"شاہینہ باجی مجھے ڈسٹرب نہ کیجئے۔ جائیے اپنی زندگی کی طرف لوٹ جائیے۔ آپ کو زندگی کی تلاش ہے۔ اور مجھے۔ زندگی نے تلاش کر لیا ہے۔

عوامی ایکسپریس ہیں

"میں کہتا ہوں، ادھر تربوز کے چھلکے مت رکھو ان کو کھڑکی سے باہر پھینکو"۔ ایک سفید کالر نوجوان نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بوڑھے آدمی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یار جاوید، بیرے کو بلانا اور اس سے کہو کہ ناشتہ واپس لے جائے۔ اس غلیظ بڈھے نے تو ناشتہ کا سارا پروگرام غارت کر دیا۔ دیکھو اب چھلکے بھی کھانے شروع کر دیئے۔ نیچ کہیں کا۔

ہمدرد انسان

سیٹھ عثمان کا لڑکا آدم گھبراتے ہوئے انداز میں گھر میں داخل ہوتا ہے "امی، امی، ذرا جلدی کیجئے۔ میرا کھدر کا جوڑا نکال دیجئے۔

ماں جوڑا تلاش کرنے لگتی ہے اور اس دوران آدم اپنے بال بکھیرنے شروع کر دیتا ہے۔ "بھئی امی آپ نے بہت دیر کر دی۔ وقت بہت تنگ ہے۔ ذرا جلدی کیجئے نا۔ ٹھیک چار بجے مجھے مزدوروں کے ایک جلسے سے خطاب کرنا ہے۔ اور ٹھیک چار بجے آدم سرمایہ داروں کے خلاف ایک زوردار تقریر کرنے کے بعد جلسہ گاہ سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے اور اپنے ڈرائیور سے دھیمے لہجے میں کہتا ہے "اُف گلا بیٹھ گیا۔ جلدی سے انٹر کانٹی نینٹل چلو۔ سخت پیاس لگی ہے"۔

چور بازاری کا مال

مداری: "بچہ جمورا۔ آ جاؤ"

"آ گیا"

"اوپر کی جیب میں کیا ہے"؟

"پرمٹ"

"نیچے کی جیب میں"

"انکم ٹیکس کا نوٹس"

"اچھا بتاؤ ان کے پیٹ میں کیا ہے"؟

"چور بازاری کا مال"

اور پھر اس توندیل شخص کی گالیوں کی آواز مجمع کے قہقہوں میں گم ہو جاتی ہے۔

صبر کرو

"عزت، ذلت، شہرت اور غربت سب اللہ ہی دیتا ہے"۔ مولوی فقیر محمد نے ایک وعظ کے دوران کہا۔ "اگر دنیا میں امیر اور غریب نہ ہوتے تو یہ کاروبار کس طرح چلتا، کوئی کسی کا کام کیوں کرتا"۔

بجا ہے۔ مولوی فقیر محمد نے بلند آواز سے کہا۔ "غربت، بہت سے عیوب سے انسان کو دُور رکھتی ہے۔ غریب آدمی اللہ سے زیادہ قریب رہتا ہے۔ اس کے برعکس امیر آدمی شراب نوشی اور فسق و فجور میں مبتلا رہتا ہے۔ غربت سے پیار کرو کیونکہ یہی تمہارا امتحان ہے۔ صبر و شکر کے ساتھ تو غربت کی "ذلتیں" برداشت کرو کیوں کہ اس کا اجر عظیم ہے"

غزل

احسان ملک

راہی دیکھ سنبھل کے
چلنا آگ میں ڈھل کے
آج وہ پھول کھلے ہیں
جو سپنے تھے کل کے
لاکھوں گیت بنے ہیں
تپتی ریت میں جل کے
جس سے کھیت ہرے ہیں
ارماں ہیں بادل کے
بن میں آگ لگائیں
جھونکے ہلکے ہلکے
نور مری آنکھوں کا
تیرے مکھ پر چھلکے
ہر مسکان نئی ہے
دُکھ کے گھر میں پل کے
چاند کو دیکھ کے احساں
رات کے آنسو چھلکے

گذشتہ سے پیوستہ

مصنف : تورے زیتر ہوم

شنگھائی کی عورتیں

ترجمہ

جمیل اے بن عاقی

افضل صدیقی

ڈرامہ "شنگھائی کی عورتیں" دنیا کی بہترین تحریروں میں سے ایک ہے۔ مصنف نے آزادی سے قبل چین کے جاگیردارانہ دور کے مظالم کی کہانی ڈرامہ کے قالب میں ڈھالی ہے۔

۶

نویں عورت : میں سال بھر میں اپنے سات بچوں میں سے تین سے محروم ہوگئی۔

دسویں عورت : میری صرف ایک بچی تھی۔ مجھے اُسے بیچ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور پھر مجھے وہ نہ مل سکی۔

وان : (واکتا کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہے) مجھے تنہا چھوڑ دو۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔

آٹھویں عورت : کہا جاتا ہے کہ انسان ہر چیز کا عادی ہو جاتا ہے لیکن میں اپنے بچوں کو مرتا دیکھنے کی عادی نہ بن سکی۔ میرا شوہر صوبہ شانسی میں یومیہ اُجرت پر کام کرتا تھا۔ زمیندار تو دوسرے زمینداروں جیسا نہیں تھا البتہ قدرت بے رحم ثابت ہوئی۔ تین سال تک مسلسل خشک سالی رہی اور قحط میں میرے پانچوں بچے مر گئے۔ ہم نے اپنے خداؤں کی خوشنودی کے لیے پرانی روایت کے مطابق خشک کھیت میں انہیں دفن کر دیا۔ لیکن وہاں دیوتا نہیں تھے۔ اگر تھے تو اُن کا گزر شانسی سے کبھی نہیں ہوا۔ ہم کام کی جستجو میں مشرق کی طرف نکل گئے۔ چار سال کے بعد ہم شنگھائی پہنچے۔ اس دوران میں ہمیں اپنے مکان کی چھت کے نیچے سونا نصیب نہ ہوا۔ اس عرصے میں میں نے تین بچوں کو جنم دیا۔ ایک بچہ سیلاب میں بہہ گیا۔ ایک بچے نے ایک کُتے سے کھانے کی کوئی چیز چھیننے کی کوشش کی۔ اس پر کُتے نے اس کے پرخچے اڑا دیئے۔ تیسری ایک بچی تھی، چھوٹی سی مگر سخت کوش۔ جب ہم شنگھائی پہنچے تو وہ ہمارے ساتھ تھی۔ شنگھائی میں میرے دو بچے اور ہوئے۔ اُن میں سے ایک کسی نامعلوم بیماری کا شکار ہو گیا۔ ہمارے مطلب کا کوئی ڈاکٹر وہاں نہیں تھا، جو اُسے بچا سکتا۔ مختصر سی زندگی میں میرے وہاں دس بچے پیدا ہوئے، اور اب اُن میں سے دو زندہ بچے تھے۔ میرا شوہر برسوں سے بیکار تھا۔ لیکن اچانک ایک روز کارخانے میں بہت سا کام نکل آیا۔ اور ہم دونوں میاں بیوی کو اس کارخانے میں کام مل گیا۔ میں کام سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن میں نے یہ بھی مناسب نہیں سمجھا کہ چھوٹے بچے کو چار سالہ بچی کی نگرانی میں چھوڑ دوں۔ چنانچہ ہم نے اسے کھانے کی ٹوکری میں دھرا اور اُسے کارخانے میں لے آئے۔ امید تھی کہ وہ چُپ چاپ پڑا رہا کرے گا۔ لیکن تیسرے روز اس نے رونا شروع کر دیا۔ وہ کرگھوں کے شور سے زیادہ تیز آواز سے رونے لگا۔ سب کو پتہ چل گیا اور ہم دونوں کو ملازمت سے نکال دیا گیا۔ بچے کو بھی اپنی زندگی دے کر اپنے رونے کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ہوا یہ کہ اُسے پلانے کے لئے میری چھاتیوں میں دُودھ ہی نہیں رہا۔ کیونکہ میں خود فاقے کر رہی تھی مگر چھوٹے بچے بڑے سکون سے مر جاتے ہیں۔ میں اُنہیں اپنی گود میں لئے رہتی اور مجھے پتہ بھی نہ چلتا کہ کب اُن کا سانس بند ہو گیا۔ ذرا بڑی عمر کے بچے تو روتے بھی تھے مگر وہ بھی جلدی چپکے ہو جاتے اور بڑی خاموشی کے ساتھ جانوروں کی طرح دم توڑ دیتے لیکن زیادہ بڑے احتجاج کرتے۔ میرا شوہر قدرت کو اور فیکٹری کے دو گنوارے مالکوں کو بُرا بھلا کہتا رہتا تھا، جو انگلستان میں رہتے تھے۔ مصیبت تو مجھ پر بھی پڑی تھی، اور یہی ردّعمل مجھ پر بھی ہوتا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ یہ ردّعمل شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ مجھے اس کا سبب نہیں معلوم۔ لیکن مجھے امید تھی کہ میرا شوہر زندہ رہے گا۔ اور پھر میں بیمار پڑ گئی۔ مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ پھر میرے شوہر نے بتایا کہ میں پاگلوں جیسی حرکتیں کرتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ اپنے مُردہ بچے کو ٹوکری میں رکھ کر اُس کارخانے کے باہر چھوڑ آؤں۔

(وہ اپنے آنسو پونچھتی ہے اور چند لمحوں کے لئے کچھ نہیں بولتی)

لوگ کہتے ہیں کہ انسان رفتہ رفتہ ہر بات کا عادی ہو جاتا ہے۔ لیکن میں اپنے بچوں کو مرتا دیکھنے کی عادی نہ بن سکی۔ جب میرا شوہر دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر مر گیا تو میں نے خودکشی کرنی چاہی۔ جیسا کہ کچھ عورتوں نے جو رنگ کے کارخانے میں کام کرتی تھیں خودکشی بھی کی تھی۔ ہم اس کارخانے کو جہنّم کہا کرتے تھے۔ لیکن میری ایک لڑکی تھی جو میرے سامنے ہوتی۔

(ساتویں عورت کی طرف اشارہ کرتی ہے)

تو اے اجنبی اگر میری کہانی تمہارے لئے کوئی معنی رکھتی ہے تو اپنے دوستوں کو ضرور

سُنانا۔ اور ان سے یہ بھی کہنا کہ اب میں بہت خوش ہُوں۔ میری بیٹی نے مجھے تین نواسے نواسیاں دی ہیں۔ اور میں اب اُن کی دیکھ بھال میں مگن رہتی ہُوں اور اب انگلستان میں رہنے والے کنوارے مالکوں کے قبضہ سے وہ فیکٹری بھی نکل چکی ہے

(دان ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیتا ہے۔ وہ بہت پریشان نظر آرہا ہے۔ وہ ترجمان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ایسے سکون کا اظہار کرتا ہے جس میں مایوسی شامل ہے)

دان : ان سے کہہ دو۔ اب بہت ہو چکا۔

ترجمان : اور نہیں سننا چاہتے؟ میں جانتا ہُوں یہ دردانگیز باتیں سننے کے لئے کلیجہ چاہئے۔ میں خود بھی اپنے آنسو ضبط نہیں کرسکتا۔

دان : میں خوشی سے اُن کی داستان سننے کو تیار ہُوں، مگر یہ بھی بہت ہے۔ تم مجھے اعتراف کرنے والوں کے پاس پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔

ترجمان : میں سمجھا نہیں

دان : تم مسٹر چانگ سے کہہ دو کہ وہ جو کچھ مجھ سے کہلوانا چاہتا ہے، میں ضرور کہہ دونگا۔

پہلی عورت : یہ اتنا پریشان کیوں ہے۔ اس سے کہو جب یہ اپنی المناک کہانی سناتی ہے تو ہم بھی بُری طرح روتے ہیں۔ اس نے ہم سب سے زیادہ مصائب جھیلے ہیں۔

ترجمان (دان سے)، چانگ کی خواہش ہے کہ تمہارا دل جو کچھ کہتا ہے وُہی تم کہو۔ وہ کسی پر دباؤ ڈالنا نہیں چاہتا۔ ہمارے ملک میں جبر کا رواج نہیں ہے۔

دان : میں جانتا ہُوں۔ اس نے مجھ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔ مجھے کِسی قسم کی اذیت نہیں دی گئی۔ ایک سال کا عرصہ میں نے اس فضا میں بسر کیا ہے۔ اگر میں نتائج بھگتنے کے لئے تیار نہ ہوتا تو مجھ سے بڑا پاگل کون ہوتا۔

ترجمان : تم پاگل نہیں ہو۔

دان : ذرا مجھے اپنا تجربہ کرنے دو۔ ہم سب نیم پاگل ہیں۔ ہم میں سے کسی پر اعتبار نہ کرنا۔

ترجمان : آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟

دان : اب مجھے سچ بولنے سے کوئی بھی نہیں روک سکے گا۔ کوئی بھی نہیں (حاضرین سے مخاطب ہوکر جوش کے ساتھ) آپ کے دل میں جو آئے وہ مجھے کہیں۔ بزدل، غدار، اصلاح یافتہ۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں بہت عرصے سے اپنی زبان پر تالے ڈالے رہا ہوں۔ ۹ ماہ سے زیادہ عرصے تک میں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا ہے۔ مگر اب سچائی کے اظہار کا وقت آگیا ہے (سکون کے ساتھ) چاہے آپ کتنا ہی کہتے رہیں کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ذرا اُن کے چہرے تو دیکھیئے۔ کیا ان چہروں پر جھوٹ لکھا ہے؟ کِسی کے دس بچوں میں سے ۹ مر گئے ہوں۔ یہ بات قابلِ یقین معلوم نہیں ہوتی۔ مذاق لگتا ہے۔ ایسے واقعات رونما نہیں ہُوا کرتے۔ تسلیم کرلینا چاہیے کہ آدم بیزاری بھی حماقت ہے۔

جو سچائی کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کا اِن باتوں میں زیادہ نہ پڑنا ہی بہتر ہے۔ اگر کوئی کسی غلط مقصد کے لئے جان دے دے جیسے اور بہت سے لوگ کر چکے ہیں تو یہ المیہ مضحکہ خیز ہوگا۔ تبت، کانگو، اسرائیل و مِصر کے درمیان صحرا میں جو کچھ ہُوا اور ہو رہا ہے اُسے ہم آخر کب سمجھنے کے قابل ہوں گے۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ نہ جاننے کے برابر ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ان معاملوں میں نہ الجھیں۔

مشکل ہمارے ساتھ یہ ہے کہ ہم اِن جھگڑوں میں الجھ جاتے ہیں۔ اِنسان کی عمر جب تیس اور چالیس کے درمیان ہو تو اُس وقت کوئی خوش گوار کیفیت نہیں ہوتی۔ اس زمانے میں انسان بہت سے بہانے گھڑتا ہے۔ بہت سے عُذر تراشتا ہے۔ مگر آپ آگے بڑھ کر کہہ دیں کہ یہ سب جھُوٹ ہے۔ ہمارے زمانے میں کوئی بھی اپنے دس میں سے ۹ بچوں سے محروم نہیں ہوسکتا۔ آپ اس جھُوٹے پراپگنڈہ میں ہرگز نہ آئیں کہ اپنے سارے بچّوں کی مَوت کا تھوڑا سا بھی تعلق اس فیکٹری کے دو مالکوں سے ہوسکتا ہے جو انگلستان میں رہتے ہیں۔

پانچویں عورت : ہیں! اِسے کیا ہوگیا ہے؟

آٹھویں عورت : مجھ سے کوئی قصُور ہُوا ہے، اگر ایسا ہے، تو مجھے بہت افسوس ہے۔

ترجمان : میرا خیال ہے اس پر معمولی سا اعصابی دَورہ پڑا ہے۔

چھٹی عورت : ارے اِن لوگوں سے اتنی سی بات بھی برداشت نہیں ہوتی۔

گیارھویں عورت : (ترجمان سے)، ہمیں سچ سچ بتاؤ، معاملہ کیا ہے؟ یہ ہم سے ضرور کچھ چھپا رہے ہیں۔

ترجمان : بس میں فوراً کوئی اور کہانی نہیں سنا سکتا۔ ذرا اسے تھوڑا سا سکون مِل جائے۔ تم، کیا تبت سے آئی ہو؟

(وہ نویں عورت کی طرف اشارہ کرتا ہے)

نویں عورت : میں چالیس سال کی عمر تک تبت ہی میں رہی۔ پھر میں نے ایک چینی سپاہی سے شادی کرلی اور پھر ہم یہاں آگئے۔

دان : تمھیں مزید کہانی سُنانے والوں کا انتظام کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میرا دل بھر گیا۔

ترجمان : سُنو تو سہی۔ اس کی کہانی بہت ولولہ انگیز ہے۔ یہ تبت میں پیدا ہوئی تھی۔

دان : میری اپنی داستان ہی اب بہت ولولہ انگیز ہوگئی ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس کا اختتام کس طرح ہوگا۔

ترجمان : میں اس عورت کو بتا چکا ہوں، مگر اس کی باتیں نہ سُننا بھی بداخلاقی ہوگی۔

دان : خیر تم اپنے طور پر سُنو، میں انتظار کر لوں گا۔

ترجمان : میں اس کے پہلے شوہر کا کردار ادا کرتا ہوں۔ کوئی اور زمیندار کا کردار سنبھالے۔

(ترجمان جب ان عورتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو عورتیں گردن ہلاتی ہیں اور پھر مسکرانے لگتی ہیں۔ کوئی بھی زمیندار کا کردار ادا کرنا نہیں چاہتا)

(باقی آئندہ)

بقیہ : شاہ حسین اور اسرائیل کا گٹھ جوڑ

دے گی۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ عوامی انقلاب کو فوج اور طاقت کے ذریعے ختم کیا جاسکتا ہے۔ انھیں جان لینا چاہیئے کہ ان کے دعوے اور اندازے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ آج ہم نے دنیا پر ثابت کر دیا ہے کہ ہمیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں جھکا سکے گی۔ انقلابات کو سودے بازی کے ذریعہ ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اسے عرب بادشاہوں کی در پردہ سازشیں بھی ختم نہیں کرسکتیں"

جی ہاں! ڈرگ کالونی کا دُوسرا نام مچھر کالونی ہے

شفیق فاروقی

مچھر کالونی، جی ہاں! یہ ڈرگ کالونی کا دُوسرا نام ہے جو جغرافیائی اعتبار سے دوآبہ پر آباد ہے۔ اس کی ایک جانب تو ملیر ندی ہے، اور دوسری جانب ایک بڑا نالہ بہتا ہے۔ اس نالے میں ڈالمیا کی پہاڑیاں اور سی اوڈی ہلز کا پانی بہہ کر آتا ہے۔ عام دنوں میں یہ ندی اور نالہ تقریباً خشک ہی رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تھوڑی بہت بارش ہوئی یہ ندی نالے اُبلنے لگتے ہیں اور ان کا پانی باقاعدہ طور پر بلاک نمبر ۵ کے کوارٹروں کے درمیان کھڑا ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی جوش میں آتا ہے تو اس بستی کے غریب عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی بھی اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ اسکندر مرزا کے زمانے میں شہید حسین شہید سہروردی نے ان باشندوں کے حال پر رحم کھا کر ایک مٹی کا پشتہ تعمیر کروا دیا تھا۔ لیکن یہ پشتہ بھی سیلاب کی نذر ہو چکا ہے۔ اب تو صرف اس کے آثار ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اس نالے کا پانی بلا کسی روک ٹوک کے تمام علاقے میں بھر جاتا ہے اور اس میں مچھر راج کرتے ہیں۔ سرِ شام ہی مچھروں کے غول کے غول گنگناتے، گیت گاتے غریب آبادی پر بلہ بول دیتے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ گندے پانی کے نکاس کا کوئی انتظام نہیں۔ گندہ اور بدبو دار پانی جابجا گلیوں اور سڑکوں پر کھڑا رہتا ہے۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اس پانی میں جلتی پر تیل کا کام کرتے ہیں۔

یہاں کی سڑکیں ۱۹۵۸ کے سیلاب کی نذر ہو چکی ہیں۔ کہیں کہیں اُن کے آثار ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں گندہ پانی کھڑا ہو یا پھر کوڑے کا ڈھیر پڑا ہو تو سمجھ لیں کہ یہاں کسی زمانے میں کوئی سڑک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کبھی یہاں کے باسی بسوں کی تنگی سے پریشان ہو کر کسی رکشہ یا ٹیکسی والے کو ڈرگ کالونی چلنے کو کہتے ہیں تو وہ اسے مذاق سمجھتا ہے اور گھور کر آگے نکل جاتا ہے۔ بعض رکشہ والے تو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ "بھائی ہماری روزی کا مسئلہ ہے، ابھی تو رکشہ کی قسطیں بھی پوری ادا نہیں کی ہیں"۔ اس وقت سواریوں کی حالت قابلِ دید ہوتی ہے جب ٹیکسی والوں سے ٹکا سا جواب ملتا ہے۔ اور پھر وہ اپنا دل مضبوط کر کے دھواں چھوڑتی ہوئی او منی بسوں کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

ڈرگ ٹاؤن شپ کمیٹی کی طرف سے باقاعدگی کے ساتھ کالونی کے باشندوں سے صفائی ٹیکس، پانی کا ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور ٹیکس ادا نہ کرنے کی صورت میں نوٹس جاری کر کے ان سے جرمانے کی رقم بھی وصول کی جاتی ہے۔ کمیٹی کے کاغذوں پر ہر ماہ تقریباً ۵ ہزار روپے کا ڈی ڈی ٹی پاؤڈر اور مچھر مارنے کی دوائیں اور کارندوں کی تنخواہوں کا حساب باقاعدگی سے تیار کیا جاتا ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ دواؤں کا اثر ڈھیٹ قسم کے مچھروں پر مطلق نہیں ہوتا۔ اور اُن کی نسل میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے اور انسانوں کی نسل وبائی امراض میں مبتلا ہو کر گھٹتی جاتی ہے۔

نوشہرو فیروز

کالج کی امدادی رقم

کلب کی تعمیر پر خرچ کر دی گئی

علی احمد میمن

نوشہرو فیروز ضلع نواب شاہ کے بازار کو شاہی بازار کہا جاتا ہے۔ یہ بازار زیادہ سے زیادہ دس فٹ چوڑا ہے۔ اس تنگ بازار میں ٹاؤن کمیٹی کی باقاعدہ اجازت سے دوکانداروں کو اپنا سامان دکانوں سے باہر بازار میں "برائے نمائش" رکھنے کی اجازت ہے اور باقی حصے میں دُوسرے کاروباری لوگ اپنے کیبن لگا کر کاروبار کرتے ہیں۔ بازار کے کچھ حصے میں کچھ لوگ دریاں بچھا کر بھی اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ اس طرح یہ بازار عام لوگوں کی آمد و رفت کے لئے صرف دو تین فٹ باقی رہ جاتا ہے۔ شہر والوں نے کئی بار ٹاؤن کمیٹی اور پولیس کی توجہ جانب مبذول کرائی لیکن شہریوں کے اس جائز مطالبے پر آج تک کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

مارکیٹ

اس شہر کی مارکیٹ تالپور خاندان کے دَورِ اقتدار میں تعمیر کی گئی تھی۔ شہر والوں نے متعدد بار ٹاؤن کمیٹی سے مارکیٹ تعمیر کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن ہر مرتبہ اس مطالبے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ آخر پیپلز پارٹی کے جنرل سیکرٹری کی بھوک ہڑتال کی وجہ سے یہ مطالبہ تسلیم ہوا اور مارکیٹ کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا۔ مارکیٹ کیا ہے ایک جیل خانہ ہے۔ جیل خانے میں بھی ہوا، پانی اور روشنی کا بندوبست ہوتا ہے۔ لیکن اس مارکیٹ میں نہ تو کوئی ہوا کی آمد و رفت کا انتظام ہے۔ اور نہ ہی روشنی کا بندوبست۔ ایک بھٹہ ہے جہاں انسانوں کو پکانے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ شدید گرمی اور گھٹن سے مارکیٹ میں رکھی ہوئی چیزیں خراب ہو جاتی ہیں۔ کئی بار مارکیٹ کے دوکانداروں نے خصوصاً گوشت اور مچھلی فروشوں نے ٹاؤن کمیٹی سے بجلی اور ہوا کے انتظام کا مطالبہ کیا، لیکن اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ لہٰذا دکانداروں نے مشترکہ لیبر یونین کے ذریعے حکام سے ہوا اور روشنی کے انتظام کا مطالبہ کیا ہے۔

افیسرز کلب

یہ کلب بھی اس شہر کی طرح قدیم ہے۔ عمارت بوسیدگی اور خستگی کی مثال بن چکی ہے۔ تین چار سال پہلے کی بات ہے۔ یہاں کے چند حضرات کو اس کلب کی اشد ضرورت محسوس ہوئی، سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے ایک پلان بنایا گیا کہ ایک ملاکھڑا (کشتی) کرا کر سرمایہ حاصل کیا جائے۔ ملاکھڑا کالج کو امداد دینے کے اعلان پر ہوا کیونکہ اس طرح تفریحی ٹیکس ادا نہیں کرنا پڑتا۔ اس طرح اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی لیکن اس رقم میں سے صرف چند سو روپے کالج کو دیئے گئے۔ اور باقی رقم افسر کلب کی تعمیر پر خرچ کر دی گئی اور اب اس کلب میں شام کو افسر صاحبان، وکلاء اور چند وڈیرے سرمایہ دار اپنا فالتو وقت تفریح میں گزارتے ہیں

ڈسپنسری

یہاں ایک ڈسپنسری ہے جو تقریباً ۴۰ سے ۵۰ ہزار افراد کے لئے ناکافی ہے۔ اس ڈسپنسری کو ڈسٹرکٹ کونسل نواب شاہ اور ٹاؤن کمیٹی کی طرف سے قلیل رقم بطور امداد ملتی ہے۔ ڈسپنسری میں ایک ہی قسم کا مکسچر اور ایک ہی قسم کی گولیاں رکھی ہوتی ہیں۔ اس ڈسپنسری میں ایک کمرہ اِن ڈور مریضوں کے لئے ہے جس میں دو عدد ٹوٹے پھوٹے

پلنگ رکھے ہوتے ہیں۔ اس کمرے میں مریضوں کے لئے پنکھا، پانی اور خوراک کا سرے سے کوئی انتظام ہی نہیں کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک وڈیرے نے ڈسپنسری کو ایک پنکھا فراہم کیا تھا۔ لیکن وہ بھی ڈاکٹر صاحب کے تبادلے کے ساتھ چلا گیا۔ اس ڈسپنسری میں کسی مریض کو داخل نہیں کیا جاتا ہے اور مریضوں کو کراچی، حیدر آباد اور نواب شاہ جانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

مُردہ خانہ

نوشہرو فیروز کا مردہ خانہ بھی ڈسپنسری کی طرح بوسیدہ ہے۔ اس مُردہ خانے میں لکڑی کے تختے میں لگی ہوئی کیلیں صاف نظر آتی ہیں۔ جو یقیناً مردوں کے بے جان جسم میں پیوست ہو جاتی ہوں گی۔ اس کی جالیاں گل سڑ چکی ہیں۔ لیکن اس کی مرمت کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انسان کو زندگی میں کوئی آرام نہیں ملتا تو مرنے کے بعد بھی اُسے سکون نصیب نہیں ہوتا۔

ڈاکخانہ

یہاں کا ڈاکخانہ ایک متروکہ مکان میں واقع ہے اور برسوں سے اس مکان کا کرایہ محکمہ ڈاک ادا کر رہا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق محکمہ ڈاک اتنا کرایہ ادا کر چکا ہے کہ اس رقم سے تین جدید قسم کے ڈاکخانے تعمیر کرائے جا سکتے تھے۔ یہ ڈاکخانہ دو چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل ہے جہاں ڈاک، تار، اور ٹیلیفون کے شعبے قائم ہیں۔ اس ڈاکخانے کے عین سامنے مُردہ خانہ ہے جس کی بدبو اتنی سخت اور پریشان کرنے والی ہے کہ ڈاکخانے میں کھڑا ہونا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی مجبوری اور شدید ضرورت کی وجہ سے لوگ ڈاکخانے تک مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق آتے ہیں۔

لاهور

چینی عوام نے اپنی لغت سے "میں" کا لفظ نکال دیا ہے

۱۲ مئی کو دفتر نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں پاک چین دوستی کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر ایک اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس میں چین اور چینی عوام کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا۔ چین کے رہنماؤں اور عوام کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے این ایس۔ ایف پنجاب کے صدر نے کہا "یہ حقیقت اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ آج دنیا واضح طور پر دو کیمپوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ایک کیمپ میں دنیا بھر کے مظلوم اور محکوم عوام کا بے باک حامی عوامی جمہوریہ چین اور اپنی سیاسی و معاشی آزادی کے لئے لڑنے والے تمام نو آبادیاتی اور نیم نو آبادیاتی ممالک ہیں اور دوسری طرف لیٹروں اور استحصالی قوتوں پر مشتمل امریکہ، روس اور ان کے پٹھوؤں کا کیمپ ہے۔

پاکستانی عوام نے ہمیشہ مظلوم عوام کا ساتھ دیا ہے۔ اور آئندہ بھی چین کی صفوں میں شامل رہ کر ظالموں کے خلاف جدوجہد کرتے رہیں گے۔"

حسام الحق کے بعد این ایس ایف لاہور کے صدر محمد ارشد بٹ نے تقریر کرتے ہوئے کہا "چینی عوام کی سامراج، سرمایہ داری اور جاگیر داری کے خلاف پر عزم جدوجہد تاریخِ عالم کا روشن باب ہے جس پر پاکستانی عوام کو فخر ہے۔ پاک چین دوستی ناقابلِ شکست قوت بن چکی ہے۔ معرکہ ستمبر میں چین کا اصولی موقف اعلانِ تاشقند کے خلاف پاکستانی عوام کی تائید اور پاکستان کی موجودہ صورتِ حال پر چین کا حقیقت پسندانہ موقف وہ تاریخی حقائق ہیں جو تاریخ کا انمٹ باب بن چکے ہیں اور پاک چین دوستی کو مضبوط و مستحکم کرتے ہیں۔ کشمیر کے بارے میں چینی عوام اور راہنماؤں کا اصولی موقف پاکستانی عوام کے دلوں کو جیت چکا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں اس لازوال دوستی کے خلاف اعلان تاشقند کے ذریعے ناکام سازش کی گئی مگر پاکستانی عوام نے ہمیشہ کی طرح متفقہ طور پر اس گھناؤنی سازش کو ناکام بنا دیا۔ اس کے علاوہ اجلاس سے غلام عباس، مرزا منیر اور افتخار رانا نے بھی خطاب کیا۔ اور چینی عوام کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسہ کے علاوہ لاہور میں پاک چین دوستی کی سالگرہ کے موقع پر متعدد جلسے منعقد ہوئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے زیرِ اہتمام پاک چین دوستی کی سالگرہ کے موقع پر ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں چینی عوام کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ مقرروں نے تقریروں میں کہا "پاک چین تعلقات ٹھوس بنیادوں پر استوار ہیں، یہ تعلقات دائمی اور ابدی حیثیت رکھتے ہیں"۔ اس اجلاس کا قابلِ ذکر پہلو یہ تھا کہ مقررین کی تقریروں کے دوران نعرے چینی زبان میں لگائے گئے۔ اجلاس کی صدارت امان اللہ خان نے کی۔

اجلاس کے دوران میانوالی پیپلز پارٹی کے نائب صدر حبیب اللہ خان انتقال کر گئے جس کے بعد جلسے کی کارروائی ختم کر دی گئی۔

پاک چین دوستی کی انجمن کے زیرِ اہتمام تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ریڈیو نیوز بورڈ کے ممبر ایم مسعود نے جو ستمبر ۶۵ء سے پہلے چین کے دورے پر تھے مختلف پہلوؤں سے چینی سماج کا جائزہ لیا۔ انہوں نے کہا "چینیوں نے اپنی لغت سے 'میں' کا لفظ نکال دیا ہے، اس کی جگہ چینی عوام نے لے لی ہے۔ انہوں نے انفرادیت کو اجتماعیت میں مدغم کر دیا ہے۔ وہ فردِ واحد کی طرح کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ جیسی بڑی طاقت بھی چین کے خوف سے کانپ اُٹھتی ہے۔ اجلاس سے مختار الحسینی، ملک معراج خالد اور اعجاز بٹالوی نے بھی خطاب کیا۔ اجلاس کی صدارت انجمن پاک چین دوستی کے صدر مختار احمد خاں نے کی۔

یہاں ترقی پسند رسالوں کا داخلہ ممنوع ہے

محمد اقبال جعفری

چکوال گورنمنٹ کالج کے طلبہ کافی عرصہ سے کالج کے پرنسپل سے مطالبہ کرتے آرہے ہیں کہ طلباء کو ملک کی صحیح صورت حال سے آگاہی کے لئے کالج لائبریری میں عوام دوست اور محنت کشوں کے ترجمان اخبارات کی منظوری دی جائے لیکن کالج کے پرنسپل نے روزنامہ مساوات، الفتح، نصرت، شہاب کی منظوری دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اور بہانہ یہ تراشا کہ ڈائریکٹر تعلیمات سے ان اخبارات کے اجراء کی منظوری حاصل کی جائیگی اس سے پہلے کالج میں اخبارات مثلاً کوہستان، نوائے وقت، چٹان، ایشیا، آئین زندگی اور ندائے ملت (مرحوم) ڈائریکٹر تعلیمات کی منظوری کے بغیر منگوائے جاتے رہے اور مظلوم عوام کی حمایت کرنے والے اخبارات کا جان بوجھ کر بائیکاٹ کیا گیا۔

ایک سامراج پسند تنظیم تعلیمی اداروں میں سامراجیت کے بیج بونے میں جس طرح مصروف ہے اُسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد درسگاہیں علم و ادب کا گہوارہ بننے کی بجائے سی آئی اے اور سامراجیت کا گڑھ بن جائیں گی۔

قارئین کہتے ہیں

عوام اپنے خلاف ہر سازش کو ناکام بنادیں

ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے شخص نے لڑکی کے ہاتھ سے پرس چھین لیا

ریاض احمد - کراچی

۲۲ مئی کی رات تھی، تقریباً دس بجے تھے۔ چند خواتین پیدل گارڈن روڈ پر جارہی تھیں۔ خواتین کے ساتھ بارہ تیرہ سال کی لڑکیاں بھی تھیں۔ ابھی انھوں نے نصف فرلانگ طے کیا ہوگا کہ اچانک اُن کے قریب ایک ٹیکسی آئی۔ اس کی رفتار کم ہوگئی تھی۔ ٹیکسی میں جو افراد بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک شخص نے ایک لڑکی کے ہاتھ سے پرس اچک لیا۔ لڑکی شور مچانے لگی مگر اتنی دیر میں ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی اور چند لمحوں میں ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اس حادثے کی اطلاع سولجر بازار کے تھانے میں دے دی گئی مگر ابھی تک ملزموں کا کوئی سراغ نہیں مل سکا اور نہ ہی پرس کی بازیابی کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔ تھانے میں رکشے کا نمبر جے کے - اے - ٹی ۴۹۶۱ بھی دے دیا گیا تھا۔ اس روڈ پر اکثر سائیکلوں پر گھومنے والے بدمعاش راہ چلتی لڑکیوں کے دوپٹے سر سے کھینچ لیتے ہیں اور مذاق اڑاتے ہیں۔ شہر میں ان دنوں اس قسم کی وارداتوں کا سلسلہ بڑھ گیا ہے۔ اس کی روک تھام کا موثر انتظام ہونا چاہیئے۔

ٹیلیویژن کو ٹیکس لگانے کا اختیار کس نے دیا ہے؟

اعجاز احمد فاروقی - کراچی

پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کے بارے میں چند باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ آپ ان پر روشنی ڈالیں۔

اوّل تو یہ بات ہے کہ ٹیلی ویژن کارپوریشن میرے خیال میں ایسی ہی ایک کارپوریشن ہے جیسے صنعتی ترقیاتی کارپوریشن۔ فرق اتنا ہے کہ اس میں بیرونی حصّہ دار ہیں جب کہ پاکستان میں دوسری کسی کارپوریشن میں جہاں تک مجھے علم ہے بیرونی حصّہ دار نہیں۔

مگر ایک عجیب بات یہ ہے کہ دوسری کسی کارپوریشن نے عوام پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جب کہ ٹیلی ویژن کارپوریشن نے عوام پر ٹیکس لگایا ہے۔ یہ بات تو تسلیم شدہ ہے کہ ٹیکس حکومتیں لگایا کرتی ہیں اور عوام یہ ٹیکس سرکاری بنکوں (سٹیٹ بنک یا نیشنل بنک) میں جمع کراتے ہیں۔ حکومت کا دستور یہ ہے کہ اخراجات اور آمدنی کا ایک بجٹ منظور کیا جاتا ہے۔ پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ کیا آمدنی مناسب ہے یا اخراجات پورے کرنے کے لئے مزید آمدنی ضروری ہے۔ جہاں تک ٹیلی ویژن کا تعلق ہے اس کے اخراجات اور آمدنی کا تفصیلی جائزہ اخباروں میں نہیں آیا۔ شاید حکومت کو بھی نہ دیا گیا ہو۔

ٹیلی ویژن کی آمدنی ٹیکس کے بعد سب سے بڑی مد اشتہارات ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق صرف کراچی سے اشتہارات کے ذریعہ آمدنی اسی لاکھ سے زیادہ ہے۔ دوسرے اسٹیشنوں کی آمدنی شامل کی جائے تو کارپوریشن کی کل آمدنی ایک کروڑ سے بڑھ جائے گی۔

جو پروگرام ٹیلی ویژن پر دکھائے جاتے ہیں اُن کے معیار سے قطع نظر باری باری سارے اسٹیشنوں سے ریلے ہوتے ہیں۔ اس طرح اگر ان پروگراموں پر کچھ خرچ ہوتا ہے تو وہ صرف ایک بار ہوتا ہے اور نمائش کئی جگہ۔ پھر اکثر پروگرام مختلف بنکوں اور تجارتی اداروں کی طرف سے پیش ہوتے ہیں۔ اس طرح خرچ کی یہ مد بھی نہیں۔ ان کے علاوہ خبریں، تبصرے اور مذاکرے رہ جاتے ہیں۔ ان پر خرچ اتنا نہیں کہ ٹیلی ویژن اپنی آمدنی سے ان کا متحمل نہ ہوسکے۔

ٹیلی ویژن پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لئے سوائے عیاشی کے کچھ نہیں۔ بھارت میں ابھی تک ٹیلی ویژن نہیں ہے۔ خیر یہ علیحدہ بات ہے کہ ٹیلی ویژن کیوں اور کس لئے شروع کیا گیا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تفریحی ٹیلی ویژن سے زیادہ تعلیمی ٹیلی ویژن کی ضرورت تھی اور اس کی طرف ابھی تک کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ ویسے تعلیم سے مراد اگر جرم کی تربیت ہے اور مقصد نئی نسل کو مجرم بنانا ہے تو ٹیلی ویژن بہ فرض بحسن و خوبی پورا کر رہا ہے۔

ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے اور چند چہروں کی بار بار زیارت سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ٹیلی ویژن محض ایک یتیم خانہ ہے جس کے لئے چندہ زبردستی وصول کیا جاتا ہے اور نجی بنک سے اعلیٰ عہدیداروں کا کوئی ربط ہے کہ سرکاری بنکوں کو فراموش کیا گیا ہے یا ہوسکتا ہے کہ کوئی اور وجہ ہو۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ ان تمام باتوں پر تبصرہ فرمائیں۔

عظیم اللہ - حیدرآباد

یہ چند ہفتوں سے ہمارے شہر کو کیسی ہوا لگ گئی ہے۔ جدھر دیکھئے۔ چاقو لہرا رہے ہیں۔ دھول دھپا اور دھما چوکڑی کی گرد اڑ رہی ہے۔ سرِ راہ چلتی ہوئی طالبات کے دوپٹے اور خواتین کے برقعے نوچے جارہے ہیں اور اگر غنڈہ عناصر کو کسی خاتون کو اغوا کرنے کا موقع ہاتھ لگ جائے تو وہ اس سے بھی نہیں چوکتے۔ چند سکّوں کی خاطر ٹیکسی ڈرائیور کو بے رحمی سے قتل کر دیتے ہیں۔

ہمارے ملک کو نازک صورتحال کا سامنا ہے قوم ایک شدید سیاسی اور اقتصادی بحران سے دوچار ہے۔ سامراج اور توسیع پسند ہمارے ملک کو پھلتا پھولتا دیکھنا نہیں چاہتے۔ یہ جو اچانک لرزہ خیز واقعات کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ اس کے پس پردہ دراصل وہ عناصر ہیں جو سازشی عناصر سے مل کر قوم و ملک کو تباہی اور تاراجیت کا شکار بنانا چاہتے ہیں۔ عوام نے جس طرح ستمبر کے معرکہ میں اتحاد، یکجہتی اور جرأت کی مثال قائم کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے، آج بھی ہم اسی اتحاد اور یکجہتی کا ثبوت دے کر سامراج، اس کے ایجنٹوں اور سرپسندوں کی ہر گھناؤنی مہم اور سازش کو ناکام بنادیں۔

•••

ہر دل پر ایک زخم نظر آئے گا

"الفتح" خدا کی بستی کے مظلوم عوام کی ترجمانی کا حق ادا کر رہا ہے۔ گذشتہ شماروں میں "نجی کالجوں کا پوسٹ مارٹم" کے عنوان سے جس طرح طلباء کی ترجمانی کی گئی ہے اس کے لئے میں آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ لیکن اس سلسلے میں اتنا عرض کردوں کہ صرف کاغذی کارروائیوں سے

دھاندلیوں کو بے نقاب کرنے کی بجائے نمٹے کی دکان میں ہونے والی عملی زیادتیوں کا بھانڈا بھی پھوڑا جائے۔ مظلوم طلبہ کی آواز دب گئی ہے۔ اس آواز کو بلند ہونے میں مدد دیں۔ طلباء کی آواز میں قوم کے دل کی دھڑکنیں شامل ہیں۔

آپ اپنے نمائندے کو درسگاہوں میں بھیجیں۔ جو طلبا سے مل کر اُن کی مشکلات معلوم کریں بعض پرائیویٹ کالجوں کی دھاندلیاں ناقابلِ برداشت بن چکی ہیں۔ میں عبداللہ کالج کا طالب علم ہوں۔ کلاسوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ طلباء کا بہت سارا قیمتی وقت برباد ہوتا ہے۔ انتظامیہ بعض اساتذہ کی باقاعدہ سرپرستی کرتی ہے۔ انتظامیہ کے اپنے بنائے ہوئے ضابطے کی روشنی میں بعض طالب علموں کو ناپسندیدہ قرار دے کر اور ان کا داخلہ کارڈ روک کر ایک سال ضائع کر دیا جاتا ہے۔ کیا یہ اقدام کسی مثبت پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔ میڈیکل فیس لی جاتی ہے مگر کالج کے احاطے میں کسی ڈسپنسری کا وجود نہیں اور اگر ہے تو تحقیقاتی کمیٹی کو بے وقوف بنانے کے لئے ایک بند کمرے کے باہر تختی پر "ڈسپنسری" لکھ دیا گیا ہے۔ گذشتہ چار سالوں میں صرف دو مرتبہ کالج میگزین شائع ہوا ہے۔ اس طرح طلبہ گذشتہ دو سال کے میگزین فنڈ کا حساب طلب کرنے میں حق بجانب ہیں۔ سال رواں میں میگزین کی قیمت اضافے کے ساتھ دو روپے مقرر کی گئی ہے جب کہ اس کی ضخامت بہت کم ہے۔ اس کے علاوہ سائنس کی فیس میں بھی دو روپے کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ کیا ان حالات میں کوئی غریب آدمی تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ یہ تو ظلم کی چند مثالیں پیش کی ہیں۔ اگر مظلوموں کا دل ٹٹولا جائے تو ہر دل پر ایک زخم نظر آئیگا

سید محمد زیدی۔ کراچی

فرید قریشی کو آلہ کار بنانیوالے
کسی دُوسرے فرید کی تلاش میں ہیں

بقیہ صفحہ ۸ سے آگے

ان کے رومان پرور دوست شریک بتائے گئے۔ اس سلسلے میں دو افراد کا نام خاص طور پر لیا گیا۔ ایک کوئی شاہد صاحب ہیں اور دوسرے یونائیٹڈ بنک نیو ٹاؤن برانچ کے ایک افسر ہیں جو فنکار آرٹ سرکل کے نائب صدر بھی ہیں۔ یہ لوگ اب کہاں ہیں؟ اور اُن سب کی بلا صرف اکیلے فرید قریشی پر کیوں آئی ہے؟ یہ شاید کسی کو معلوم نہیں —!

اس وقت جب کہ مولانا فرید قریشی اس اسکینڈل میں چاروں طرف سے جکڑے جا چکے ہیں اس کے اصل سرپرست جنھوں نے فرید قریشی کو ایک آلۂ کار کی طرح استعمال کیا، بالکل الگ تھلگ بیٹھے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کبھی ان کوچوں سے گزرے بھی نہ ہوں۔ لیکن قصور ان سب کا بھی نہیں ہے۔ نوکر شاہی کے ان کارندوں، خوشحال افسروں اور سرمایہ داروں کو دراصل طبیعت کے بہلا دے کے لئے ان ثقافتی سرگرمیوں کی ضرورت ہے۔ پہلے کوٹھوں پر پائل چھنکتی تھی۔ تو یہ اس کی سرپرستی کرتے تھے۔ لیکن ان کوچوں پر اب سستی تفریح کی تلاش میں جانے والوں کی حکمرانی ہے۔ پھر انہیں سماجی رتبوں اور سیاسی حیثیتوں کا خیال بھی ہے۔ لہٰذا وہ اب ثقافت کو پروان چڑھاتے ہیں۔ اس کے لئے انھیں ایسے آلۂ کار چاہئیں جو ان کی طبیعت کو بہلانے کا اہتمام بھی کر سکیں۔ اور ثقافت کے بارے میں ان کی تقریریں بھی اخبارات میں چھپوا سکیں۔

مولانا فرید متوسط طبقے کا ایک آدمی ہے۔ جو اپنی تنخواہ کے علاوہ بھی کچھ کمانے کے خواب دیکھتا ہے۔ اس کے لئے وہ بھی ثقافت کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ اور اس طرح ثقافت کی سرپرستی کرنے والوں سے اتحاد کے ایک رشتے میں منسلک ہو جاتا ہے۔ وہ نوجوان بھی اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں جن کے دل میں نوجوان طالبات سے وحید مراد اسٹائل کے عشق لڑانے کی حسرتیں جنم لیتی ہیں۔ لیکن جب یہ کھیل طشت از بام ہوتا ہے تو تمام کردار پسِ منظر میں چلے جاتے ہیں اور منظر عام پر صرف ایک شخص رہ جاتا ہے۔ جس کے خلاف اخبارات بھی لکھتے ہیں اور بلدیہ سے لیکر انتظامیہ تک سب تحقیقات کرنے کے احکامات بھی جاری کرتے ہیں۔ اس پورے سانحہ کے نتیجہ میں مولانا فرید کے بچوں کے چہروں پر تو سراسیمگی نظر آتی ہے لیکن مولانا کی سرپرستی کرنے والے اس کے بعد بھی ثقافت کی ترقی کے گن گاتے ہوئے کسی نئے فرید قریشی کی تلاش میں مگن رہتے ہیں۔

زباں دراز ہے، ذوقِ عمل کا نام نہیں

شہنشاہ حسین

جہاں پہ چھوڑا ہے تم نے، مرا مقام نہیں
یہاں تو میرے تصور کے صبح شام نہیں

جہاں ہوس کے درندے اُجاڑ دیں محفل
بساط لُٹ چکی بادہ نہیں ہے جام نہیں

جہاں حیات کی قدریں ہیں صرف اِستحصال
جہاں زبان تو ہے پر جُراٴتِ کلام نہیں

جہاں رسُومِ مساوات کفُر کہلائیں
جہاں نظامِ اخوّت کوئی نظام نہیں

یہ ریش و جُبّہ و دستار ہیں یہ کون بُزرگ
زباں دراز ہے، ذوقِ عمل کا نام نہیں

فساد و بغض دلوں میں، زباں پہ دینِ مُبیں
پھر اور کیا ہے، جو مِلّت سے انتقام نہیں

شکستہ ساز لئے پھر رہے ہیں دیوانے
جنوں کا زور ہے، عقل و خرد کا نام نہیں

علاقائی زبان اور ثقافت کے نام پر

بعض سرمایہ دارانہ ذہنیت کے فلمساز عوام کو گمراہ کر رہے ہیں

تنویر واسطی

موجودہ زمانے میں فلم کو اظہار کا موثر ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس میڈیم کی افادیت کو سمجھنے والے تو بہت سارے لوگ ہیں مگر اس سے صحیح معنوں میں کام لینے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن سب سے نمایاں اور قابلِ ذکر وجہ مقصدی فلموں کی باکس آفس پہ ناکامی ہے گویا یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ اس میڈیم کے افادی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اگر کوئی فلم بنائی جائے تو وہ تجارتی اعتبار سے ناکام ثابت ہوگی۔ سوچ کا یہ انداز کس حد تک صحیح ہے، یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ حالانکہ اس ضمن میں کئی ایسی مثالیں دی جا سکتی ہیں جو اس نظریہ کو عملی طور پر غلط ثابت کرتی ہیں

کچھ لوگ جو نسبتاً ہوشیار واقع ہوئے ہیں انہوں نے عوام کو بے وقوف بنانے کے لئے نئے حربے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ فلم کے افادی پہلوؤں کے نام پر عوام کو دھوکا دیا جائے۔ انہی حربوں میں سے ایک حربہ فلم اور ثقافت کا گٹھ جوڑ تھا۔ گئے دنوں یہ مسئلہ بڑے زور شور سے سامنے آیا۔ کہ فلم ہماری ثقافت کی نمائندگی کیوں نہیں کرتی؟ ہمارا جو صدیوں پرانا کلچر ہے اُسے اس موثر ترین ذریعہ سے کیوں دُور رکھا گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سوالات اپنی جگہ بڑی اہمیت کے حامل تھے اور اُن پر کان نہ دھرنا کسی حد تک فلم سازوں کے لئے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہمارے ہوشیار فلمسازوں نے اس مسئلہ میں خاصی دلچسپی لی، اور پھر انہوں نے کمال ہوشیاری سے ثقافت کے نام پر تہذیب و اخلاق کی دھجیاں بکھیرنا شروع کر دیں۔ جب ثقافت کی بات چلی تو کہا گیا کہ صاحب اس ملک کی کوئی ایک ثقافت تو نہیں ہے جسے ہم فلموں میں دکھا سکیں۔ یہ تو مختلف زبانوں، مختلف تہذیبوں کا دیس ہے۔ اس پر کچھ لوگوں نے مشترکہ ثقافت کی تلاش شروع کر دی، جو ہنوز جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گی۔ جہاں تک مشترکہ ثقافت کا تعلق ہے، یہ ایک ایسی ترکیب ہے، جسے اس کے نام لیوا خود بھی مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ غالباً اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف کلچرز کو ملا کر بین الصوبائی ترکیب کے کھرل میں اچھی طرح کوٹا جائے۔ اس مقصد کے لئے انگریزی کا ہاون دستہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پھر جب تمام کلچر یک جان ہو جائیں تو انھیں کسی بھی درآمد شدہ چھلنی سے چھان لیا جائے اور جو کچھ حاصل ہو، وہ مشترکہ ثقافت کہلائے۔

ہمارے فلم سازوں نے مشترکہ ثقافت کی دریافت تک وقت گزارنے کے لئے ایک دُوسرا نسبتاً سہل راستہ اختیار کیا۔ اور علاقائی کلچر کے نام پر مختلف علاقوں کی زبان، تہذیب اور رسم و رواج کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ اُن کا پہلا نشانہ پنجاب بنا۔ شاید اس لئے کہ اہلِ پنجاب بڑے زندہ دل واقع ہوئے ہیں۔ اور فلمسازوں کو غالباً یہ توقع تھی کہ اہلِ پنجاب اُن کی حرکتوں کو اپنی روایتی زندہ دلی کے ساتھ نظر انداز کر دیں گے لیکن وہ بھول گئے تھے کہ پنجاب ایک غیرت کا نام ہے۔ وہ اپنے رسم و رواج، اپنی تہذیب اور زبان کو فلمسازوں کی ہوسِ زر کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیں گے۔ شروع شروع میں جب پنجابی فلمیں نمائش کے لئے پیش ہوئیں انھیں علاقائی زبانوں کی حوصلہ افزائی کے طور پر برداشت کیا گیا۔ پنجاب کی علاقائی زبان اور کلچر کی حوصلہ افزائی تو خیر کیا ہوتی البتہ فلم سازوں کی خوب ہمت بندھی، اور انہوں نے اس میدان میں دیدہ دلیری سے پیشقدمی شروع کر دی۔ موجودہ پنجابی فلمیں دیکھنے کے بعد ایک اجنبی جو تاثر قائم کرتا ہے وہ کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ پنجاب ایک ایسا علاقہ ہے جہاں مٹیار جب پانی بھرنے جاتی ہے تو اس کے جسم پر انتہائی قیمتی اور چست لباس ہوتا ہے جس کے بال شہروں میں رہنے والی انتہائی فیشن ایبل لڑکیوں کے بالوں کی طرح ہوتے ہیں اور جو چلتی ہواؤں سے اڑتی ہے۔ محبوب سے ملاقات کے بعد وہ بس ناچ ہی باقی، جمپ اور لانگ جمپ پر مشتمل انتہائی ہیجان خیز رقص کرتی ہے۔ وہ ہر محبِ وطن پاکستانی کے لئے، جسے اپنے دیس کی ثقافت سے پیار ہے۔ دُکھ کا باعث ہے۔

کیا یہی علاقائی ثقافت کی نمائندگی ہے؟

فلمسازوں نے عوام کو بیوقوف بنانے کا جو ڈرامہ شروع کر رکھا ہے۔ وہ اب ختم ہو جانا چاہیے۔ پنجابی فلمیں ضرور بنیں۔ ان میں پنجاب کے کلچر کی بھرپور عکاسی ہو۔ لیکن یہ جو طوفانِ بدتمیزی برپا ہے اس کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ ہمیں دولت بٹورنے والے فلمسازوں کا پنجاب نہیں چاہیے۔ ہم اُس پنجاب کو فلموں میں دیکھنا چاہتے ہیں جہاں کسان صبح سورج نکلنے سے پہلے اپنے کھیتوں کا رُخ کرتا ہے اور دن بھر کی محنت کے بعد رات کو چوپال میں بیٹھ کر روایتی انداز میں اپنے یار دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتا ہے جو پورے گاؤں کی عزت کا محافظ ہوتا ہے۔ پڑک نہیں مارتا لیکن ظالم سے نمٹنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ جہاں کی مٹیار اپنے سیدھے سادے لباس میں جب باہر نکلتی ہے تو کوئی آنکھ اُس کی طرف نہیں اُٹھتی۔ جو پورے گاؤں کی عزت ہوتی ہے۔ جس کے چہرے پر معصومیت، پاکیزگی اور وقار ہوتا ہے۔ اس پنجاب میں شادی بیاہ بھی ہوتے ہیں، میلے ٹھیلے بھی لگتے ہیں۔ گاؤں کے جوان بھنگڑہ بھی ڈالتے ہیں۔ میلوں ٹھیلوں میں گبھروؤں کے ساتھ مل کر یا مقابلے میں کوئی مٹیار بھنگڑہ نہیں ڈالتی بلکہ وہ ایسے موقعوں پر مردوں میں شامل ہونے کی جرأت بھی نہیں کر سکتی۔ البتہ مٹیارنیں شادی بیاہ اور تہواروں کے موقع پر سکھیوں کے سنگ گاتی ہیں۔ ڈھولک کی تھاپ اور کھنکتے قہقہوں کی آوازیں، گبھروؤں کے دلوں میں گدگدی ضرور کرتی ہیں لیکن اس کسک میں ایک لذت ہوتی ہے، اس محبت میں پاکیزگی ہوتی ہے جو فلم والوں کو نظر نہیں آ سکتی۔

بدقسمتی سے کچھ لچر اور سوقیانہ فلموں کی کامیابی سے متاثر ہو کر دولت کے ان پجاریوں نے اپنے موقف کے حق میں یہ دلیل دینا شروع کر دی کہ عوام ایسی فلمیں پسند کرتے ہیں۔ یہ دلیل غلط ہے فلم بین طبقہ بیہودہ اور لچر فلموں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ فلم ہمارے یہاں سستی تفریح تصور کی جاتی ہے اور دن بھر کے تھکے ہارے غریب عوام کی واحد تفریح کا سہارا یہی فلمیں ہیں اور وہ ایسی فلموں کو دیکھنے پہ مجبور ہیں۔ اُن کے سامنے آپ جو چیز بھی رکھ دیں گے۔ وہ بیچارے اُسی پر اکتفا کریں گے۔ اب یہ فلمسازوں پر منحصر ہے کہ وہ انھیں ان کی تہذیب اور ثقافت کا صحیح عکس دکھاتے ہیں یا بارہ مصالحے کی چاٹ والی اخلاق سوز اور بیہودہ فلمیں جن کا پورا ملک،

اب وُہی فلمیں کامیاب ہوں گی

جن میں پنجاب کا اصل رُخ پیش کیا جائیگا

الفتح

کی ثقافت و تہذیب سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا چالاک فلمساز محنت کرنا نہیں چاہتا۔ یہ صرف فلمساز پر ہی منحصر نہیں، ہر وہ شخص جو بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ ذہنیت کا حامل ہے، کم سے کم وقت میں، تھوڑے سے سرمایہ سے لاکھوں کمانے کے فارمولے پر عمل کر رہا ہے۔ اور یہی فارمولا، پنجابی فلموں کی لچر تخلیق کا سبب ہے۔ لیکن شاید اب یہ لوگ زیادہ عرصہ تک عوام کو بے وقوف نہ بنا سکیں۔ پنجابی فلموں میں بڑھتی ہُوئی عریانی اور بیہودگی کے خلاف نفرت بڑھتی جا رہی ہے۔ اور فضول اور لچر فلموں کی ناکامی کا دور شروع ہو گیا ہے۔ عوام نے ایسی فلموں سے بیزاری کا جو بھرپور اظہار کیا ہے، وہ پنجاب کی تہذیب، ثقافت اور زبان کے لئے ایک خوش آئند مستقبل کی ضمانت ہے۔ اب صرف وہی پنجابی فلم کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہے جس میں پنجاب کے کلچر کی بھرپور عکاسی کی گئی ہو۔

ترکی بہ ترکی



اے ایس سلیمان بنام ذوالفقار علی بھٹو

درویش

۱۴ر جون کے اخبارات میں خبر شائع ہُوئی کہ کرشک سرامک پارٹی کے صدر اے ایس سلیمان نے لاڑکانہ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کے بعد کہا کہ میں ڈھاکہ سے طویل ترین فاصلہ طے کر کے لاڑکانہ آیا ہُوں۔ میں نے مسٹر بھٹو سے سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا ہے۔ بنیادی باتوں پر ہمارے درمیان اتفاق رائے موجود ہے اور اس پر ہمارا سمجھوتہ ہو چکا ہے۔"

۳ر مارچ کے اخبارات میں خبر شائع ہوئی تھی:
"کرشک سرامک پارٹی کے مسٹر اے ایس سلیمان نے آج ایک بیان میں کہا کہ مسٹر بھٹو ملک میں ایک اقلیت کی آمریت قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جسے پاکستان کے عوام کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ لوگ وہ وقت بھول جائیں جب لاڑکانہ کا شہزادہ ایک آمر کے سائے تلے ملک پر حکمرانی کر رہا تھا۔ انھوں نے صدر پر زور دیا کہ وہ فوری طور پر اقتدار عوامی لیگ کو منتقل کر دیں کیونکہ ملک کو بچانے کا واحد راستہ یہی رہ گیا ہے۔

احتسابی اداروں کے اختیارات میں اضافہ

بقیہ: اداریہ

قدم اُٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں جن سے قوم کا معاشی عدم توازن دور ہو سکے۔

ایک اور انتہائی خطرناک حقیقت یہ ہے کہ بنک بھی مختلف سرمایہ داروں سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ اپنے طبقے کو احتساب کی زد سے محفوظ رکھنے کے لئے خود ہی ایسے طریقے نکال لیں گے جن سے رقم کا بہت بڑا حصّہ عارضی طور پر کسی کھاتے میں چلا جائے گا۔ اور جب نئے نوٹ جاری ہوں گے تو یہ رقم ان کھاتوں سے نکل آئے گی۔ سرمایہ داروں کے اس دائرہ اثر کو ختم کرنے کے لئے مارشل لاء حکام کو حرکت میں آنا چاہیئے۔ واپس آنے والی رقموں کا جائزہ لینے والی کمیٹیوں کے اختیارات وسیع ہونے چاہئیں تاکہ وہ کسی دباؤ یا لالچ سے بے نیاز ہو کر یہ کام کر سکیں۔

آخر میں ہمارا یہ بھی مطالبہ ہے کہ جب حکومت تمام حساب کتاب طے کر لے تو قوم کو اپنی کارروائی سے ضرور باخبر کرے اور بتائے کہ کس کس سرمایہ دار سے کتنا ٹیکس وصول کیا گیا۔ اور کس کس سرمایہ دار سے کتنی رقم دستیاب ہوئی۔

ہفت روزہ الفتح کراچی

کا شاندار

سالنامہ

تیزی سے ترتیب و تدوین کے مراحل طے کر رہا ہے

لکھنے والے

احمد ندیم قاسمی	مولانا کوثر نیازی
صفدر میر	فارغ بخاری
ابراہیم جلیس	ہاجرہ مسرور
شوکت صدیقی	ظفر اللہ پوشنی
ابن انشاء	اقبال میر
جمیل الدین عالی	خدیجہ مستور
عبدالحمید عدم	حسن عابدی
قتیل شفائی	محسن بھوپالی
ایم جے زاہدی	منہاج برنا
افضل صدیقی	زین الدین خاں لودھی
معراج محمد خاں	طارق عزیز
علی احمد	عابد زبیری
انور سجاد	اور دوسرے حضرات



ذوالفقار علی بھٹو

چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی

کا خصوصی، غیر مطبوعہ اور نہایت اہم مضمون

بھارت کے خفیہ عزائم

اس میں وہ سب کچھ ہوگا جو آپ پڑھنا — اور — جاننا چاہتے ہیں

نیوز پرنٹ کی شدید قلت کی وجہ سے یہ سالنامہ قدرے تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ حتمی تاریخ کا اعلان عنقریب کر دیا جائے گا۔

ضخامت: معمول سے زیادہ — قیمت: ایک روپیہ — سرورق: سات رنگوں میں

ایجنٹ حضرات اور مشتہرین کرام نے توقع سے بڑھ کر ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے۔ ہم ان کے انتہائی شکر گزار ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ اُن کی مطلوبہ تعداد اور جگہ فراہم کر سکیں

جنرل مینیجر ہفت روزہ الفتح۔ ۸۷ ڈی نرسری کمرشل ایریا پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس۔ کراچی ـ ۲۹

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
10 - 17 JUNE, 1971

Δ 1149 A